ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

مئی۔جون ۲۰۲۰

www.inzaar.pk

May , June 2020

زندہ لوگ اپنے حوصلے سے مشکلات کو اپنی ترقی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں
آیئے ہم مل کر کرونا کی اس مشکل گھڑی کو اپنی ترقی کا ذریعہ بناتے ہیں

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

لاک ڈاؤن میں بازاروں اور ڈاک کے نظام کی بندش کی بنا
پر مئی اور جون کا رسالہ ایک ساتھ شائع کیا جا رہا ہے
قیمت: 80 روپے

ماہنامہ
اِنذار

مئی/ جون 2020ء رمضان/ ذوالقعدہ 1441ھ

جلد 8 شمارہ 6-5

فی شمارہ ـــ 40 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 900 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 600 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر (vp) یا ڈرافٹ)

ابو یحییٰ کے قلم سے

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201 , 0312-2099389
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

مچھر اور جہنم

انسانوں کو اذیت دینے والی مخلوقات میں مچھر کا نام بہت نمایاں ہے۔ کم وبیش ہر موسم اور ہر خطے میں کم یا زیادہ موجود رہتے ہیں۔ یہ انسانوں کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں کاٹتے ہیں اور ان کا خون چوستے ہیں۔ یہ خاموشی سے وار کرتے ہیں اور اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں کہ انسان کے جوابی حملے سے پہلے کاٹ کر اڑ جاتے ہیں۔ جس کے بعد بے چارہ انسان اپنی جلد کو کھجاتا اور سہلاتا رہ جاتا ہے۔

مچھر ایک سکینڈ میں اپنے پر ہزار دفعہ تک ہلا سکتا ہے جس کی وجہ سے ایک بھنبھناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مچھر کان کے پاس آجائے تو یہ بھنبھناہٹ انسان کو مچھر کے حملے سے قبل ہوشیار کر دیتی ہے اور وہ ہاتھ ہلا کر مچھر کو بھگا دیتا ہے۔ تاہم مچھر کا کاٹنا ایک ایسا تکلیف دہ عمل ہے کہ ان کی یہ آہٹ جو پروں کے ہلانے کی آواز سے پیدا ہوتی ہے، انسان کو گھبرا دینے کے لیے بہت ہے۔

یہ انسان جو اتنا کمزور ہے کہ چھ فٹ کا ہو کر چھوٹے سے مچھر کی آہٹ سے گھبرا جاتا ہے، ایک روز اسے جہنم کی دھاڑ بھی سننی ہے۔ یہ آواز جہنم کے ان شعلوں کے بھڑکنے سے پیدا ہوگی جن کی بلند لپٹیں آسمان کو بھی سرخ کر دیں گی۔ اس آگ سے صرف وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو آج امتحان کی اس دنیا میں، جب یہ جہنم پردہ غیب میں مستور ہے، اس سے بچنا اپنا سب سے بڑا ہدف بنا لے۔ وہ سچ اور حق کے سامنے جھکنا اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنا دے۔ وہ تعصب، خواہش اور مفاد کے بجائے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا سیکھ لے۔

جس نے یہ کر لیا اس سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ جہنم کی آواز بھی نہیں سنے گا ہمیشہ کے لیے اپنے دل پسند عیش میں زندہ رہے گا۔ جس نے برعکس رویہ اختیار کیا وہ پہلے جہنم کی آواز سنے گا اور پھر اپنے جرائم کی پاداش میں اس جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

لڑکا آرہا ہے

مشتاق احمد یوسفی اردو زبان کے بے مثال مزاح نگار ہیں۔انھوں نے اپنی کتاب آب گم میں ایک قدیم سماجی اوراب عملاً متروک رسم یعنی آرسی مصحف کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس موقع پر جب دولہا زنانے میں دلہن کے ساتھ آکر بیٹھتا تھا تو اس کے آنے کی اطلاع یہ کہہ کردی جاتی تھی کہ لڑکا آرہا ہے۔اس کا سبب پردہ دار خواتین کو مطلع کرنا ہوتا تھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھ جائیں۔ انھوں نے اس سے یہ دلچسپ نکتہ پیدا کیا کہ بہت سے لوگ بڑھاپے میں صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ جملہ سن سکیں کہ لڑکا آرہا ہے۔ورنہ اصلاً جس مقصد کے لیے شادی کی جاتی ہے،انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

کچھ اس سے ملتی جلتی صورتحال ان مذہبی لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو خدا کے دین کے اصل مقصد یعنی نجات آخرت اور ایمان واخلاق سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ،مگر اس کے علاوہ انھیں مذہب کے نام پر رائج ہر چیز میں الجھنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔مذہب کے نام پر کیے گئے فرقہ وارانہ مناظرے ہوں،فقہی نکات ہوں،علمی مباحث ہوں،فنی موشگافیاں ہوں،معاصر مسائل ہوں؛ ہر چیز ان کی دلچسپی کا موضوع ہوتی ہے،مگر دین کا اصل مقصد یعنی نجات آخرت میں وہ زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں نہ ایمان واخلاق کے اس راستے کو پوری طرح اختیار کرنا اور نصرت دین کے کام میں حصہ ڈالنا ان کا مسئلہ ہوتا ہے جو آخرت کی نجات اور بلندی درجات کا اصل راستہ ہے۔

ایسے لوگوں کی تمثیل یوسفی صاحب کے بیان کردہ واقعے میں اس شخص کی طرح ہے جس کی دلچسپی دلہن سے زیادہ اس بات میں ہے کہ لوگوں کو اپنے بارے میں یہ کہتا ہوا سنے کہ ''لڑکا آرہا ہے''۔قیامت کے دن ایسے لوگ جب ''جنت کی دلہن'' کو سامنے دیکھیں گے تو انھیں احساس ہوگا کہ جس چیز کو حاصل کرنے کا موقع انھیں ملا تھا،اسے انھوں نے بہت چھوٹی چیز کے لیے چھوڑ دیا۔

جواب دینے کی نفسیات

انسان کو اس دنیا میں جو چیزیں سب سے بڑھ کر خیر سے محروم کرتی ہیں، ان میں سے ایک چیز مخالفت کی وہ نفسیات ہے جو کسی سچائی کو ماننے کے بجائے اپنے تعصّبات کی بنیاد پر اسے رد کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ انسانی ضمیر اسے غلط چیز سے وابستہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے انسان سچائی کے جواب میں کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے یہ بات کتنی ہی خلاف واقعہ ہو، چاہے یہ بات کتنی ہی غیر متعلق ہو۔

موجودہ دور میں اس کی ایک مثال بعض مسلمانوں کا وہ رویہ ہے جس میں انھیں جب کبھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے زوال میں اصل عامل ان کی اخلاقی پستی اور علم وفن میں پیچھے رہ جانا ہے تو وہ فوراً جواب دینے کی نفسیات کے تحت کچھ نہ کچھ بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ عصر حاضر میں مغربی اقوام نے اپنی فوجی برتری کی بنیاد پر دنیا میں برتری حاصل کی ہے۔ اس لیے ہمیں بھی فوجی برتری کی ضرورت ہے۔

اس طرح کا استدلال سطحیت کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ دور میں مغربی اقوام کی فوجی برتری اصلاً ان کی علمی برتری کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنے علم کی بنا پر ایسے ہتھیار بنا لیے ہیں جن کا مقابلہ بہادر ترین افراد بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا کھربوں ڈالر پر مشتمل فوجی بجٹ اسی معاشی ترقی کا مرہون منت ہے جو سرتا سر علم اور ٹیکنالوجی پر استوار ہے۔

ایسے میں اگر ہمیں فوجی برتری بھی حاصل کرنی ہے تو اس کا راستہ بھی علمی ترقی ہے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں پیش رفت ہے۔ تعلیم کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنانا ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، ہم دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کسی معقول بات کا کوئی نہ کوئی جواب دینا ہماری پستی کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ معقول باتوں کو تسلیم کرنے کی عادت ڈالی جائے۔

صبر اور نماز

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مشکلات سے نمٹنے کے لیے دو نکاتی فارمولا بیان کیا ہے۔ یعنی اے اہل ایمان! صبر اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ ایک بڑی گہری اور بامعنی ہدایت ہے۔ اسے اس کے درست پس منظر میں سمجھ لیا جائے تو زندگی کی مشکلات سے نمٹنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

انسان اپنی شخصیت میں ایک نفسیات کا نام ہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی ہمارے ساتھ کچھ اچھا یا برا ہو اور کسی بھی پہلو سے ہو جیسے مالی نقصان، بیماری، کوئی دل آزاری وغیرہ، ان سب کا آخری اثر ہماری نفسیات پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں دراصل ہماری نفسیات ہی کو مضبوط کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ نفسیات مضبوط ہو جائے تو انسان بڑی سے بڑی مشکل سے بھی آسانی کے ساتھ نمٹ لیتا ہے۔

آیت میں پہلی چیز صبر ہے۔ صبر کا مطلب برداشت سمجھا جاتا ہے۔ برداشت ایک منفی چیز ہے۔ یعنی جب آپ کچھ نہ کر سکیں تو مجبور ہو کر کسی صورتحال کو جھیلنے کا نام صبر ہے۔ صبر اس سے بہت مختلف اور بہت برتر چیز ہے۔ یہ اپنی قوت ارادی کو استعمال کر کے اپنی نفسیات کو مجروح ہونے سے بچانا، حالات کا منفی اثر قبول کرنے سے انکار کر دینا، حوصلے سے کام لینا اور ان سب کے نتیجے میں اپنے موقف، عمل اور رویے پر ثابت قدمی کا نام ہے۔

اس دنیا میں انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کو دی گئی قوت ارادی ہے۔ یہ وہ ڈرائیونگ فورس ہے جو زندگی کی پوری گاڑی کو چلاتی ہے۔ مصائب و آلام اسی قوت ارادی کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان پست حوصلہ، مایوس، منفی اور بے عمل ہو جاتا ہے۔ مگر جب کوئی انسان صبر سے کام لینے کا فیصلہ کرتا ہے تو پہلی چیز جو اسے واپس ملتی ہے وہ قوت ارادی کا

ہتھیار ہے۔

انسانی نفسیات کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جتنی وہ حالات سے متاثر ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ وہ قوت ارادی سے متاثر ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جب قوت ارادی کو استعمال کیا جاتا ہے تو غموں کے ڈھیر میں دب کر مجروح ہوجانے والی نفسیات زندہ ہوجاتی ہے۔

انسان قوت ارادی کے ہتھیار کو استعمال کر کے خود پر جبر کرتا ہے۔ اپنی نفسیات کو کھینچ کر منفی سے مثبت دائرے میں لے جاتا ہے۔ وہ مایوسی کو ذہن سے جھٹک کر امید کا دامن پکڑتا ہے۔ دماغی تعطل کی کیفیت سے نجات حاصل کر کے سوچ بچار کا عمل شروع کرتا ہے تاکہ مسئلے کا کوئی حل نکل سکے۔ بے عملی کو عمل سے بدلتا ہے۔ یوں وہ اپنے مقصد، ہدف، نقطہ نظر اور نظریے پر ڈٹا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ منفی حالات مثبت حالات میں بدل جاتے ہیں۔

آیت میں بیان کردہ دوسری چیز نماز ہے۔ صبر اگر اپنی طاقت کو استعمال کرنے کا نام تھا تو نماز گویا دعا کی شکل میں خدا کی عظیم ہستی کو اپنی مدد کے لیے بلانے کا نام ہے۔ انسان لاکھ اپنی قوت ارادی کو استعمال کر لے لیکن انسان بہت کمزور اور عاجز مخلوق ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا اگر خدا اس کی مدد کے لیے نہ آئے۔ نماز اسی عظیم خدا کو مدد کے لیے بلانے کا نام ہے۔

خدا اس کائنات کا بادشاہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے اور اس سب کے ساتھ وہ بے حد کریم و رحیم اور دعاؤں کا سننے والا بھی ہے۔ چنانچہ نماز کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بے پناہ طاقت کا تصور شعور میں تازہ کر کے اسے مدد کے لیے پکارا جائے۔ جب عالم کا پروردگار مدد کے لیے آجائے تو مسئلہ ہر حال میں حل ہوتا ہے۔ یا تو خارج کے حالات بدل جاتے ہیں یا پھر یہ حکمت الٰہی نہیں ہوتی تو انسان کی وہ نفسیات بدل جاتی ہے جو مجروح، دل شکستہ اور شکست خوردہ ہوچکی تھی۔ یوں صبر اور نماز مل کر ہر مشکل مسئلہ حل کردیتے ہیں۔

خدا زمیں سے گیا نہیں ہے

آپ نے کرونا وائرس کی تباہ کاریوں کا ذکر سن لیا ہوگا۔ یہ بھی سن لیا ہوگا کہ مغربی ممالک بھی ابھی تک اس کو پوری طرح کنٹرول نہیں کر پا رہے۔ یہ بھی سن لیا ہوگا کہ بیرون ملک سے آنے والے مسافروں اور زائرین کی ایک بہت بڑی تعداد جسے بغیر اسکریننگ کے ملک کے اندر آنے دیا گیا، وہ پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔ یہ لوگ جس طرح ملک بھر میں کرونا کے وائرس کو پھیلائیں گے اور ہمارے محدود وسائل کے نتیجے میں جو ہولناک منظر نامہ جنم لے گا، وہ بھی صاحبان علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ سارے حقائق اپنی جگہ ہیں۔ مگر کچھ اور چیزیں بھی حقیقت ہیں، ان کو بھی جان لینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تادم تحریر اللہ تعالیٰ ہی دنیا کا نظام چلا رہے ہیں اور اس کا کوئی امکان نہیں کہ مستقبل میں ان کی جگہ کوئی اور لے سکے۔ یہ کہ وہ زندہ اور ہر دوسری چیز کی زندگی اور موت کے مالک ہیں۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے بغیر یہاں کوئی ذرہ اپنی جگہ سے ہلتا ہے نہ پتّا درخت سے گرتا ہے۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو نیند آتی ہے نہ کبھی اونگھ اسے اپنی مخلوق سے غافل کرتی ہے۔ یہ کہ اس کا اقتدار آسمان وزمین کی ہر چیز پر محیط ہے۔ یہ کہ کوئی ستارہ ہو، کوئی انسان ہو یا پھر کوئی وائرس ہو، کوئی اس کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

یہ سارے حقائق بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بے حد وحساب طاقت ور ہستی ہیں، مگر اس کے ساتھ کچھ اور حقائق بھی ہیں۔ اپنی ذات میں وہ اصلاً ایک رحیم وکریم ہستی ہیں جن کی رحمت ان کی ہر دوسری صفت پر غالب رہتی ہے۔ گرچہ وہ ظلم وسرکشی کو ہرگز پسند نہیں کرتے...... تکبر اور غفلت میں مبتلا لوگ انھیں سخت ناپسند ہیں...... شرک، الحاد، بدعت، فرقہ واریت کو وہ صراط مستقیم سے انحراف سمجھتے ہیں، مگر ان کا کرم، ان کا رحم، ان کا حلم، ان کا تحمل تمام انسانیت کی برائی سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔

ایسے میں شرک والحاد کے بدترین مظاہرے کے باوجود، سرکشی وغفلت کے انتہائی رویے کے باوجود کچھ لوگ اگر ان کی طرف رجوع کرنے پر تیار ہوجائیں تو پھر وہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ ان خالص اہل ایمان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کروڑوں اربوں مجرموں کو بھی نظر انداز کردیتے ہیں۔

اس لیے اگر انھوں نے کرونا کے وائرس کے ذریعے سے لاکھوں لوگوں کی ہلاکت کا فیصلہ کر بھی لیا ہو، اگر انھوں نے انسانیت کو اس کی سرکشی پر پکڑنے کا فیصلہ کر بھی لیا ہو تب بھی وہ اپنے ہر فیصلے کو واپس کرسکتے ہیں۔ ان کی نگاہ کا ایک اشارہ ہوگا اور ہر چیز ٹھیک ہوجائے گی۔ نااہل اور ناکارہ حکمرانوں کو صحیح فیصلوں کی توفیق دے دی جائے گی۔ عوام کو حماقتوں کے ارتکاب سے روک دیا جائے گا۔ مرض کا علاج دریافت ہوجائے گا۔ وائرس کا پھیلاؤ رک جائے گا۔ موت کا سیل رواں تھم جائے گا۔

مگر اس کا طریقہ کوئی وظیفے پڑھنا نہیں ہے۔ بلا سوچے سمجھے رٹے رٹائے الفاظ دہرانا نہیں ہے۔ اس کا طریقہ مذہب کے نام پر فضول ٹوٹکے اختیار کرنا نہیں ہے۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ خود بتاچکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے نبی! جب تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو، میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا ہوں۔

خدا کو براہ راست پکارنا ہی کرنے کا اصل کام ہے۔ جب بندے اپنے آپ کو رب کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں تو وہ سنتا ہے۔ جب وہ سچی توبہ کرتے ہیں تو وہ سنتا ہے۔ جب وہ تعصب، خواہش اور غفلت سے پاک قلب سلیم لے کر حاضر ہوتے ہیں تو وہ سنتا ہے۔ خدا آسمان پر اسی پکار کا منتظر ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ زمین پر کون اسے اس طرح پکارتا ہے۔ جو سچے دل سے براہ راست پکارے گا وہ جواب بھی سن لے گا۔ آزمائش شرط ہے کہ خدا زمیں سے گیا نہیں ہے۔

کرونا وائرس: چند نکات کی وضاحت

کرونا وائرس کے حوالے سے ایک نکتہ یہ اٹھایا جا رہا ہے کہ ثابت ہو گیا کہ دنیا اسباب کے تحت چل رہی ہے۔ کرونا وائرس عالم اسباب کے تحت انسانوں میں پھیلا اور عالم اسباب ہی میں اس کا علاج بھی دریافت ہو جائے گا، خدا کا اس پورے معاملے میں کوئی رول نہیں۔ بلکہ اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں۔ اب مستقبل سائنس اور علم ہی کا ہے۔

اس احمقانہ بات کے جواب میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ پڑھ لیجیے۔ موجودہ علمی اور سائنسی ترقی سے پہلے بھی دنیا میں بیماریاں، وبائیں پائی جاتی تھیں اور قدیم انسان سائنس کی موجودہ ترقی کے بغیر ان کو جھیل گیا اور آج بھی کرہ ارض پر موجود ہے۔ یہ خدا ہے جس نے جدید سائنس کے بغیر بھی انسان کو اس کرہ ارض پر باقی رکھا تھا اور تا قیامت باقی رکھے گا۔ سائنس، اس کی ترقی، اس کی خدمات اپنی جگہ، مگر یہ خدا کا نعم البدل نہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ سائنس ہو یا دیگر اسباب یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں، خدا نہیں ہیں۔ ان کو نعمت سمجھیں گے تو شکر گزاری پیدا ہوگی۔ خدا سمجھیں گے تو سرکشی پیدا ہوگی جو ناقابل معافی جرم ہے۔

کرونا وائرس کے حوالے سے ایک نکتہ یہ اٹھایا جا رہا ہے کہ اس وائرس نے ثابت کر دیا کہ مذہب کا عملی دنیا میں کوئی کردار نہیں۔ یہ بات کہی جا رہی ہے کہ کرونا وائرس میں نہ آب زم زم موثر ہے اور نہ کوئی دعا اور وظیفہ۔ اب دنیا کی امید صرف سائنسدان اور ان کی لیبارٹریاں ہیں۔

اہل مذہب کچھ بھی کہتے رہیں، اصل مذہب یعنی دین اسلام نے کبھی اپنے آپ کو اس حیثیت میں پیش نہیں کیا کہ وہ کسی بیماری کے علاج کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اگر شفا کہا ہے تو اسے دلوں کے امراض کی شفا قرار دیا ہے نہ کہ بیماریوں کی شفا۔ اس لیے اعتراض اگر ہوتا ہے تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو دین کو غلط حیثیت میں پیش کرتے ہیں۔

ایک سوال یہ اٹھایا جا رہا ہے کہ اس طرح کی وبائیں خدا پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟ کیا خدا لوگوں کو خوفزدہ رکھنا چاہتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے ظہور کا الزام اول تو خدا پر ڈالنا ہی درست نہیں۔ اکثر ایسی چیزیں انسانوں کی اپنی غلطیوں، جسمانی اور اخلاقی ناپاکیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں سب کچھ خدا کے اذن سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے کہ ان وباؤں کے پھیلنے میں خدا کی حکمت کیا ہے؟

ایسی وباؤں میں خدا کی حکمت کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ناہمواریاں ہی انسانوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ وہ زندگی اور دنیا کو بہتر بنانے کے لیے سنجیدہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایسی چیزیں انسانوں کو خدا کی ان نعمتوں اور عافیتوں کی یاد دلاتی ہیں جو انھیں مسلسل حاصل رہتی ہیں لیکن لوگ ان کا شکر ادا نہیں کرتے۔ تیسرے یہ کہ ایسی تکالیف انسان کو خدا کے پیغمبروں کے اس انذار کی شدت سے روشناس کراتی ہیں جو وہ آخرت کے حوالے سے کرتے ہیں۔

آخرت کی دنیا میں جو لوگ دلوں کی بیماریوں یعنی تکبر، غفلت، سرکشی، ظلم کا شکار ہوں گے وہ خدا کی ابدی رحمت، عافیت اور انعام کی جگہ یعنی جنت سے محروم ہو کر اپنی ناشکری اور بدکاری کی سزا پائیں گے۔ اس سزا میں موت سب سے بڑی نعمت ہوگی، مگر موت بھی ایسے مجرموں کے لیے ختم کر دی جائے گی۔ اسلام اسی ابدی انعام کی طرف بلاتا اور ابدی سزا سے بچانے کی دعوت ہے۔ یہ وبائیں انسان کو غفلت سے جھنجوڑ کر انبیا کی بات سننے پر آمادہ کرتی ہیں۔

ایک شبہ یہ ہے کہ کرونا کی بیماری میں حرم کعبہ ویران ہو گیا۔ طواف رک گیا۔ اس طرح کے شبہات ایک دفعہ پھر اسلام سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح کر دیا تھا کہ انسانی جان کی حرمت کعبہ کی تمام تر حرمت کے باوجود اس سے زیادہ ہے۔ اس لیے انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے چاہے طواف روکا جائے یا کوئی اور مناسب قدم اٹھایا جائے، دین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ کرونا وائرس اتنا بڑا خطرہ نہیں جتنا بڑا خطرہ اس کا پھیلاؤ ہے۔ چین، اٹلی، ایران اور امریکہ وغیرہ کے اعداد و شمار یہ صاف بتاتے ہیں کہ جس وقت کرونا وائرس سے متاثرہ افراد کی تعداد بڑھی تو اموات ایک دم سے بڑھ گئیں۔

پاکستان میں ابھی تک کرونا کا پھیلاؤ کم ہے۔ اس لیے اموات بہت کم ہے۔ یہ پھیلاؤ بڑھا تو اللہ نہ کرے، مگر امکان ہے کہ اموات بہت زیادہ بڑھ جائیں گی۔ اس وائرس کے پھیلاؤ کو عام لوگوں کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔ مگر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے ہاں لوگوں کا غیر سنجیدہ رویہ ہے۔ اس کو ایک ذاتی تجربے سے میں سمجھاتا ہوں۔

جس روز بے نظیر بھٹو صاحبہ کی رحلت کا سانحہ پیش آیا، میں پنجاب کے شہر جہانیاں کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں موجود تھا۔ مجھے اس رات لاہور جانا تھا۔ میں لاہور کے لیے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ مجھے فون پر اطلاع مل رہی تھی کہ ملک بھر میں ہنگاموں کی کیا صورتحال ہے۔ اس وجہ سے میں بہت تشویش میں تھا۔ مگر ہمارے ڈبے میں کچھ لوگ اس سانحے اور ملک کے حالات سے بے پرواہنسی مذاق اور ہلے گلے میں مصروف تھے۔ ان کو میں نے سمجھایا مگر وہ بے حس لوگ نہ باز آئے۔ کچھ ہی دیر میں ہماری ٹرین بیچ میں رک گئی اور معلوم ہوا کہ اب سب لوگ جہاں ہیں، وہیں پھنس چکے ہیں۔ یہ وہ موقع تھا کہ وہ بے حس لوگ بھی پہلی دفعہ پریشان ہو گئے۔

یہ ہے ہمارے عوام کی وہ نفسیات جو باعث تشویش ہے۔ یعنی جب تک وہ خود مسئلے میں نہیں آتے تب تک وہ کسی معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ایسے میں باشعور لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ باقی لوگوں کو سنجیدہ اور باشعور بنائیں۔ خاص طور پر کرونا وائرس کے پھیلاؤ میں معاون بننے والے ہر رویے کے بارے میں بلا لحاظ دوسروں کو متنبہ کریں۔

اس میں دوسروں سے ہاتھ ملانا، دوسروں کی طرف منہ کر کے چھینکنا یا کھانسنا، غیر ضروری طور

پر گھومنے پھرنے یا کھانے پینے باہر جانا، شادی بیاہ اور دیگر سماجی یا مذہبی تقاریب کا اہتمام کر کے ان میں شریک ہونا اوراس جیسی تمام چیزیں شامل ہیں۔

ہمارے دین میں انسانی جان کی حرمت سے بڑی کوئی چیز نہیں۔اسی طرح توکل کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں ہے کہ احتیاط اور اسباب کے بغیر زندگی گزاری جائے۔ ہر نوجوان، طاقتور اور صحت مند شخص کو اس موقع پر اپنے بارے میں نہیں بلکہ کمزور لوگوں کا سوچنا چاہیے۔اس لیے کہ طاقتور انسان تو اس وائرس سے بچ نکلے گا، مگر وہ صحت مند ہونے سے قبل دس کمزور لوگوں تک یہ وائرس منتقل کر دے گا۔کسی کمزور کو اگر ہماری غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے وائرس منتقل ہوا تو اس کے نقصان کی اخلاقی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی۔

احتیاط کے ساتھ اس موقع پر اللہ کی طرف رجوع کرنا بہت ضروری ہے۔عام حالات میں لوگ اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔لیکن اگر وہ ایسی وباؤں میں بھی اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو پھر یہ دل کے سخت ہو جانے کی علامت ہے۔یہ سنگ دلی انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں ہلاکت میں ڈالنے کا باعث بنے گی۔مگر اسباب کی رعایت کے ساتھ ہم اللہ کی طرف رجوع کریں گے تو اس کی رحمت ہمارے حال پر ضرور متوجہ ہوگی۔ان شاء اللہ یہ وبا کم سے کم نقصان کے ساتھ رخصت ہو جائے گی یا پھر اس کا علاج دریافت ہو جائے گا۔

یاد رکھنے کی آخری بات یہ ہے کہ کرونا کی وبا تو جلد یا بدیر رخصت ہو جائے گی۔مگر موت کا مسئلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔موت کا سامنا ہم میں سے ہر شخص کو کرنا ہے۔اس مسئلے کا ایک ہی علاج ہے۔خدا کو سب سے زیادہ اہم بنالیں اور مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کریں۔یہ رویہ اختیار کرنے والوں کے لیے موت سعادت کا دروازہ کھولے گی اور باقی لوگوں کے لیے بس ہلاکت ہے۔

کرونا وائرس: ہمیں کیا کرنا ہے؟

کرونا وائرس کی وبا ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ یہ انسانیت کی ایک اجتماعی آزمائش ہے۔ یہ انسانیت کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں سے ہماری کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ان کا شعور ہم میں سے ہر شخص کو ہونا چاہیے۔ پہلے ہم آزمائش کے پہلو سے اپنی ذمہ داری کو بیان کریں کریں گے اور پھر تنبیہ کے پہلو سے۔

آزمائش کی اس گھڑی میں ہمیں پہلی چیز جس سے بچنا ہے وہ خوف اور دباؤ ہے۔ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہمیں کچھ نہیں ہوسکتا سوائے اس کے جو ہمارے لیے ہمارے رب نے لکھ دیا ہے۔ اس لیے اطمینان رکھیے کہ ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں مل سکتی جو ہمارے لیے مقدر نہیں ہے۔ اس لیے خوف میں جینا ایک لایعنی چیز ہے۔

تاہم ہمارے لیے کوئی بری چیز اگر مقدر ہے تب بھی ہم اسے خود سے دور کر سکتے ہیں۔ خدا سے عافیت مانگنا اس کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ مصیبت کی اس گھڑی میں جو لوگ مالی طور پر مشکلات میں گھر چکے ہیں، ان کی بنیادی ضروریات میں مدد کرنا خدا کی رحمت اور عافیت حاصل کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ کمزوروں کی دعاؤں سے آپ کے نصیب کی مشکلات بھی دور کر دی جاتی ہیں۔ یہ دعائیں سمیٹنے کا بہترین موقع ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ ہماری اجتماعی دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے کہ کسی گھر میں فاقے کی نوبت نہ آنے دیں۔

اس کے علاوہ وہ چیزیں جو ہمیں بیمار کر سکتی یا بیماری کے پھیلاؤ کا سبب بن سکتی ہیں، ان سے دور رہنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ جیسے مصافحہ کرنا، پبلک مقامات پر بلا عذر نکلنا، سماجی اور مذہبی تقریبات میں شمولیت وغیرہ۔ توکل کے مذہبی پہلو کو پورا کرنے کے لیے بھی ان اسباب کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ نیز افواہیں پھیلانا اور غیر مصدقہ چیزوں کو آگے بڑھانا بھی وہ رویہ ہے جس

سے اس موقع پر مکمل اجتناب ضروری ہے۔

خواتین کی یہ بہت اہم ذمہ داری ہے کہ اس وقت ان کے مرد وقت کا بڑا حصہ گھر میں گزار رہے ہیں۔ ایسے میں گھر میں لڑائی جھگڑے یا کسی اور وجہ سے گھر کا ماحول خراب نہ ہونے دیں۔ اسی طرح ہر وقت میڈیا یا سوشل میڈیا پر لگے رہنے کے بجائے والدین اس موقع کو غنیمت سمجھیں اور بچوں کی تربیت کا منصوبہ بنائیں اور اپنی اصلاح کے لیے اپنا بھی محاسبہ کریں۔

تنبیہ کے پہلو سے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اس موقع پر گناہوں سے خاص طور پر بچیں۔ اس وقت ہر شخص گھر بیٹھا ہے۔ چنانچہ فالتو وقت بہت ہے۔ فارغ آدمی کا دماغ شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ اس کی وسوسہ انگیزی سے بچنے کے لیے اچھی اور مثبت مصروفیات تلاش کریں اور خود کو ان میں مصروف کر دیں۔

تنبیہ کے پہلو سے ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ وقت اللہ کے حضور رجوع کر کے اپنے اور تمام انسانیت کے گناہوں پر معافی مانگنے کا ہے۔ انسان چاہے مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، مسلمان ہوں یا غیر مسلم پچھلے دو تین سو برس سے وہ خدا کے غضب کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔ مسلمان ایمان و اخلاق اور دعوت کی اپنی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہیں اور غیر مسلموں نے الحاد کی شکل میں بدترین سرکشی کو جنم دیا ہے۔ یہ دونوں جرائم ناقابل معافی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سچے دل سے توبہ کر کے اپنے مالک کے شکر گزار بنیں اور اعلیٰ ایمانی اور اخلاقی رویوں کو اختیار کریں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان کے اصول پر بنائی ہے۔ یہ امتحان اکثر شکر کا ہوتا ہے۔ یعنی ہم عام طور پر نعمت و عافیت میں رہتے ہیں، مگر بدقسمتی سے اسے امتحان ہی نہیں سمجھتے اور ناشکری اور غفلت کے باعث فیل ہو جاتے ہیں۔ مگر مصائب کا امتحان طبعاً ہمیں جگا دیتا ہے۔ اس لیے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ہم سب کو جاگ جانا چاہیے۔ یہی عافیت کا راستہ ہے۔

End of Our Story?

رمضان میں قلم اٹھانا قلب وذہن پر بہت بوجھ ڈالتا ہے۔کیونکہ اس کے لیے قرآن کو چھوڑنا پڑتا ہے۔خدا کے سامنے سے اٹھ کر بندوں کے سامنے جانا پڑتا ہے۔ خدا سے مکالمے کے بجائے مخلوق سے مکالمہ کرنا پڑتا ہے۔ تاہم رات کے اس آخری پہر قلم اٹھانے کا سبب کچھ خاص ہے۔ تہجد کے وقت خدا کی حضوری کو چھوڑ کر قلم کی مزدوری کو اختیار کرنے کا سبب یہ سوال ہے کہ کیا واقعی یہ ہماری کہانی کا انجام ہے۔

Is it Really the End of Our Story?

اس سوال کا پس منظر بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس سے قبل جو میں لکھنے جارہا ہوں اس کا کچھ حصہ صالح طبیعتوں پر گراں گزرے گا اور خاص کر ماہ رمضان میں۔ اس لیے قارئین میں سے جو صالحین ہیں، ان سے یہ درخواست ہے کہ آگے مضمون پڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ البتہ جو ہمارے جیسے گناہ گار ہیں وہ پڑھتے رہیں۔

ہمارے شعور کی آنکھ ضیاالحق مرحوم کے اسلامی مارشل لاء میں کھلی تھی۔اس دور میں ٹی وی پر کسی خاتون نیوز کاسٹر کے بال نظر آجانا بھی من جملہ فواحش میں شمار ہوتا تھا۔ایسے میں پاکستانی فلم انڈسٹری کا سورج غروب ہونا مقدر تھا جو اس وقت تک بہت محدود مارکیٹ کے باوجود بڑی کامیابی سے بھارتی فلم انڈسٹری کا مقابلہ کررہی تھی۔

ایسے میں ستر کی دہائی کے اختتام پر ہمارے ہاں وی سی آر کا دور شروع ہوا جو اسی کی دہائی میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔وی سی آر کا استعمال اُس دور میں ایک ہی تھا۔وہ یہ کہ اس پر پوری پوری رات بھارتی فلموں کو دیکھا جائے۔اس پوری رات کی بھی اپنی کہانی ہے۔ دراصل اُس وقت تک ہمارا معاشرہ مڈل ایسٹ کا پیسہ آنے کے بعد کے کایا پلٹ ماحول سے پہلے کا معاشرہ تھا۔شہری علاقوں میں ریڈیو سب سے بڑی گھریلو عیاشی تھی۔اے سی، گاڑی وغیرہ تو دور کی بات

ہے گھروں میں ٹی وی بھی کم ہوتا تھا۔ ایسے میں عام مڈل کلاس گھروں میں وی سی آر کا کیا سوال تھا؟ چنانچہ وی سی آر کرایہ پر آتا تھا اور ساری رات جاگ کر تمام اہل خانہ اور اہل محلّہ انڈین فلمیں دیکھتے اور کرایہ کو پوری طرح استعمال کرتے۔

مجھے ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ غالبًا سن اسی یا اکیاسی میں والد صاحب کے ایک صاحب حیثیت دوست نے دو تین دن کے لیے اپنا وی سی آر ہمیں دے دیا۔ اس دن ہم نے چھتیس گھنٹے نان اسٹاپ انڈین فلمیں دیکھی تھیں۔ دو تین برس بعد بڑے بھائی سعودی عرب سے وی سی آر کی سوغات لائے تو شاید یہ اُس دور کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ الحمدللہ کوئی نماز اور کوئی فلم اس زمانے میں قضا نہیں ہوتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ فلمیں زندگی سے نکلتی چلی گئیں۔ مذہبی اثرات اتنے بڑھے کہ فلمیں تو دور کی بات ہے، باپردہ اور باشرع پی ٹی وی سے بھی اتنا پرہیز ہوگیا کہ اس کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے جہاں گھر کا ٹی وی رکھا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈین فلموں کو جس طرح ہماری ترسی ہوئی نسل نے اپنی ٹین ایج میں دیکھا، اس کا کوئی تصور آج کی نسل نہیں کرسکتی نہ ان سے پہلے کی نسل کرسکتی ہے۔ کیونکہ ضیاالحق کے اسلامی مارشل لا میں یہی ایک تفریح موجود تھی اور چونکہ انڈین فلموں پر پابندی تھی اس لیے فلم بینی کے گناہ کی لذت دوگنی ہوا کرتی تھی۔

اس داستان سرائی کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رشی کپور اور نیتو سنگھ بچپن سے ہمارے لیے گھر کے افراد کی طرح رہے ہیں۔ اور ہم انسان ہیں پتھر نہیں ہیں کہ ایسے تعلق کے بعد کسی کی موت سے متاثر نہ ہوں۔ ایسے میں آج صبح اخبار میں رشی کپور کی بیوہ نیتو سنگھ کا یہ ٹویٹ پڑھا جو ذہن سے چپک گیا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے انتقال پر لکھا۔

End of Our Story.

جیسا کہ عرض کیا کہ رمضان میں کچھ لکھنے لکھانے کا ذہن نہیں ہوتا اس لیے بس اس کو پڑھ کر

رہ گئے تھے، مگر رمضان کی اس رات میں خدا کے حضور پیش ہو کر بار بار یہی سوال ذہن میں گونجتا رہا:

Is it Really the End of Our Story?

قرآن اس سوال کا واضح جواب دیتا ہے کہ نہیں یہ ہماری کہانی کا اختتام نہیں۔ اس دنیا کی کہانی آخرت کی کہانی کے بغیر ادھوری ہے۔ مگر یہ بات دنیا کو کیا قرآن بتائے گا؟ یہ کام تو اس نے حاملین قرآن کو دیا تھا۔ مگر وہ کیا کر رہے ہیں؟ وہ دنیا پر اپنا کھویا ہوا اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ قرار دینے کی مہم میں مصروف ہیں۔ وہ دیگر فرقوں پر اپنے فرقے کی برتری قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ باقی جو عوام الناس ہیں وہ ایک فرقہ وارانہ اور ظاہر پرستی پر مشتمل دین داری کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں اور اس دنیا میں اپنی جنت بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو بتانا صرف یہ تھا کہ ان کے لیے یہ دنیا جہنم بنی رہے گی اور ان پر ذلت اور مغلوبیت مسلط رہے گی جب تک وہ قرآن کے پیغام کے علمبردار بن کر کھڑے نہیں ہوتے۔ یہ پیغام ایمان کا ہے۔ غیر اللہ کے بجائے خدائے واحد کی بندگی، اسی سے محبت اور اس سے ملاقات پر ایمان ۔ خدا کے اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کا پیغام ہے۔ مسلمان اس ایمان و اخلاق کو اپنی زندگی بنالیں، غیر مسلموں پر دین حق کی حجت خود ہی قائم ہو جائے گی۔ اس خدمت کے نقد انعام کے طور پر مسلمانوں کو دنیا پر غلبہ دے دیا جائے گا۔ ورنہ جو غیر مسلم مرے گا وہ خدا کو یہی بتائے گا کہ ہم قرآن کو نہیں مسلمان کو جانتے تھے اور وہ تو ہر طرح ہمارے جیسے لوگ تھے۔ ان کا مذہب ہم سے اچھا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس جواب پر ان کا فیصلہ اللہ کرے گا مگر ہم پر بدبختی کا سایہ یونہی قائم رہے گا۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

حادثے کا سبق

پچھلے دنوں کراچی میں ایک جہاز شہری آبادی پر گر گیا جس میں سو سے زائد افراد سوار تھے۔ اس حادثے میں جہاز کی زد میں آنے والے متعدد مکانات بھی تباہ ہوئے۔ جہاز کے مسافروں کے ساتھ مکانوں کے متعدد رہائشی بھی اس ناگہانی حادثے کی نظر ہو گئے۔ مگر خوش قسمتی سے کچھ مسافر جہاز کے گرنے کے باوجود بھی بچ گئے اور معمولی زخموں کے سوا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

ایسے ہی ایک مسافر کا انٹرویو ٹی وی پر نشر ہوا جس میں اس نے حادثے سے قبل کی تفصیلات کو بتانے کے بعد کہا کہ جہاز کے گرنے کے ساتھ ہی اس کے ہوش جاتے رہے۔ ہوش آیا تو ہر طرف زخمیوں کی چیخ و پکار تھی یا سیاہ دھواں۔ ایک جگہ روشنی محسوس ہوئی تو اس نے سیٹ بیلٹ کھول کر اس سمت دوڑ لگائی۔ یہ ایک مکان کی چھت تھی جہاں سے اس نے دس فٹ نیچے چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔

اس خوش قسمت مسافر کا یہ ردعمل اور جان بچانے کا یہ عمل عین فطری تھا۔ مگر اس کی بات سنتے ہوئے مجھے قیامت کے دن کا وہ نقشہ یاد آ گیا جو قرآن مجید بیان کرتا ہے۔ عام حالات میں ہر انسان حادثے میں زخمی ہونے والوں کی مدد کرتا ہے۔ مگر اس مسافر نے جو خود حادثہ کا شکار تھا، ہوش آنے پر زخمیوں کی چیخ و پکار پر توجہ دینے کے بجائے اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ لگائی۔ یہی قیامت کے دن کی کہانی ہے۔ جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور سب کو اپنی اپنی پڑی ہو گی۔

قیامت کا دن بہت ہی ہولناک اور تکلیف دہ ہو گا۔ جہاز کی آگ سے کہیں زیادہ خوفناک جہنم کی آگ سب کے سامنے دہک رہی ہو گی اور اس کا سیاہ دھواں ہر طرف چھا رہا ہو گا۔ اس روز کی گرمی اور تپش سے زبانیں منہ سے باہر نکلی ہوں گی۔ ایسے میں کون کسی کی فکر کرے گا؟

جہاز کا حادثہ ہم میں سے بیشتر لوگوں کو اپنی زندگی میں نہیں دیکھنا، مگر یہ دن ضرور دیکھنا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اُس آگ سے بچاؤ کا کیا سامان سچے ایمان اور عمل صالح کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

کشمیریوں کے لیے راہ عمل

اہل کشمیر کے ہر دکھ سے ہم دکھی ہو جاتے ہیں۔ جب بھی کسی نوجوان کی تصویر سامنے آتی ہے جو کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں اپنی جان کو کھو بیٹھتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہل کشمیر اور اہل پاکستان کب سبق سیکھیں گے اور وہ راستہ اختیار کریں گے جو واحد موثر راستہ ہے۔

کوئی جنگ اب کشمیر کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ایٹمی جنگ سے برصغیر قبرستان اور شمشان گھاٹ بن سکتا ہے مکمل کشمیر کسی کو نہیں مل سکتا۔ گوریلا وار کو بھی تین عشرے ہو چکے ہیں۔ اس راستے سے بھی کشمیر کاز کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ واحد راستہ وہی ہے جو قائداعظم محمد علی جناح نے اختیار کیا تھا۔ دنیا کے حکمران انگریز جس استدلال کو فیصلہ مانتے تھے، قائداعظم نے اسی کی بنیاد پر ان سے ایک قانونی اور اخلاقی جنگ لڑی تھی۔ تن تنہا لڑی اور جیت بھی گئے۔

آج کی غالب اقوام انسانی حقوق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ کشمیری نوجوان اپنا مقدمہ انسانی حقوق کی بنیاد پر غالب اقوام کے سامنے لڑنا شروع کر دیں تو زیادہ نہیں ایک عشرے میں وہ یہ جنگ جیت لیں گے۔ ظاہر ہے کہ انتہا پسند بھارتی حکمران ان کی بات نہیں سنیں گے۔ انھیں اپنا مقدمہ غالب اقوام کے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک دوسری جنگ انھیں یہ لڑنی ہے کہ اہل کشمیر کو تعمیری مثبت سوچ اور تعلیم میں سب سے آگے لے جانا ہے۔ کیونکہ تعلیم اور مثبت سوچ ہی کسی گروہ کو دوسروں سے آگے لے کر جاتی ہے نہ کہ کوئی سیاسی انتظام۔

گنتی کے چند باصلاحیت اور ذہین نوجوان یہ دوطرفہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیں اور اسے اپنی زندگی کا مشن بنا لیں تو صرف ایک عشرے میں کشمیر کی قسمت بدل جائے گی۔ ورنہ بدامنی اور بربادی کے سوا اس خطے کا کوئی اور مستقبل نہیں۔

عرفان خان کا خط

[حال ہی میں معروف بھارتی اداکار عرفان خان کا انتقال ہوگیا۔ انھیں دو سال قبل عین اپنے کیریئر کے عروج پر کینسر کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کے حوالے سے اُس وقت ابویحییٰ صاحب نے ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ ان کی وفات پر یہ آرٹیکل انذار میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جبکہ عرفان خان کا اصل خط بھی آرٹیکل کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔]

عرفان خان بین الاقوامی شہرت کے حامل ایک انڈین ایکٹر ہیں۔ ان کا شمار بالی وڈ کے بہترین اداکاروں میں کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل انھیں کینسر کی ایک شاذ قسم تشخیص ہوئی۔ حال ہی میں انھوں نے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہونے والے ایک خط میں اپنی اس بیماری کا انکشاف کیا۔ ساتھ ہی بڑی خوبصورتی سے ان احساسات کی ترجمانی کی جو زندگی میں عین عروج کے وقت موت کی اچانک آہٹ ملنے پر کسی انسان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ خط برصغیر اور پوری دنیا میں موجود ان کے کروڑوں مداحوں میں پھیل گیا۔ میں نے اس خط کو بار بار پڑھا ہے۔ انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔ یہ بڑا موثر خط ہے۔ یہ خط بظاہر عرفان خان نے دنیا بھر میں موجود اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو لکھا ہے، مگر میرے نزدیک اس خط کے دو پہلو اور ہیں جو بین السطور موجود ہیں اور جن کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلا یہ کہ یہ خط خدا نے ان کے ذریعے سے پوری انسانیت کو لکھوایا ہے۔ اس خط کے ذریعے سے ہر انسان کو خدا کا یہ پیغام پہنچ جانا چاہیے کہ انسان اپنا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے، موت کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ موت خدا کے حضور پیشی کا نام ہے۔ یہ عارضی دنیا سے نکل کر ابدی دنیا میں چلے جانے کا نام ہے۔ یہ انسانی دنیا سے نکل کر خدائی دنیا میں حاضری کا نام ہے۔ یہ پرچہ امتحان حل

کر کے نتیجہ امتحان سننے کا مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے خاتمے کا نہیں امتحان کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔

یہ موت ہر انسان کو آنی ہے مگر عام حالات میں لوگ اس سب سے بڑی حقیقت سے پہلو تہی کیے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی معروف شخصیات کے ساتھ پیش آنے والے ایسے واقعات باقی لوگوں کو اس عظیم حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

انسانیت کے علاوہ اس خط کے دوسرے مخاطب مسلمان ہیں۔ مسلمان ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کے وارث ہیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ انبیا کے اصل مشن یعنی آخرت کے انذار اور یاددہانی کو زندہ رکھیں۔ مگر مسلمان اس کام کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مسلمان عرفان خان کے خط سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ موت کو ابدی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے۔

مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری سے یہ غفلت ایک انتہائی سنگین جرم ہے۔ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی سزا کے طور پر دنیا بھر کے مسلمانوں پر ذلت، مسکنت اور مغلوبیت مسلط کر دی گئی ہے۔ مگر مسلمان اپنے اس جرم کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ وہ انسانیت تک خدا کا پیغام پہنچانے پر تیار نہیں۔ ان کا اصل مسئلہ دنیا کا غلبہ اور اقتدار ہے۔ بالکل فلمی اداکار عرفان خان کی طرح جس کا سب سے بڑا مسئلہ دنیا تھی اور جس دنیا سے رخصتی کے اعلان نے اس کو توڑ کر رکھ دیا۔

آج کا مسلمان بھی اسی دنیا کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔ مسلمانوں کی قیادت اسی دنیا کے غلبے اور اقتدار کو سب سے بڑا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ جبکہ خدا کی اسکیم میں یہ دنیا ایک امتحان، ایک عارضی قیام گاہ اور ایک متاع حقیر کے سوا کچھ نہیں۔ عرفان خان کا یہ خط دنیا بھر کے ان مسلمانوں کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر دنیا ہی کو اصل مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ مگر جب موت سامنے آئے گی، جب ڈاکٹر جواب دے دیں گے، جب ہم اپنے اپنے حصے کے کینسر کی خبر سنیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہ تھی۔

فرد کا معاملہ تو پھر اسی روز طے ہوگا جب اصل زندگی شروع ہوگی۔ مگر مسلمانوں کا اجتماعی معاملہ آج ہی طے ہو چکا ہے۔ ان پر اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی کے جرم میں ذلت، مغلوبیت اور رسوائی مسلط کی جا چکی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کرلیں، ذلت کی یہ رات ان پر سے ختم نہیں کی جائے گی جب تک کہ وہ دنیا تک آخرت کا پیغام پہنچانا اور آخرت کا انذار کرنا اپنا اصل مقصد نہیں بنا لیتے۔

عرفان خان کا تحریر کردہ خط

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمہاری آنکھ اس جھٹکے سے کھلتی ہے جو زندگی تمہیں جگانے کو دیتی ہے، تم ہڑ بڑا کے اٹھ جاتے ہو۔ پچھلے پندرہ دنوں سے میری زندگی ایک سسپنس والی کہانی بنی ہوئی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انوکھی کہانیوں کا پیچھا کرتے کرتے میں خود ایک انوکھی بیماری کے پنجوں میں پھنس جاؤں گا۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی مجھے اپنے نیورو اینڈ وکرائن (آنتوں سے متعلق) کینسر کے بارے میں پتا چلا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کے مریض پوری دنیا میں بہت ہی کم ہیں، نہ ہونے کے برابر۔ مریض نہیں ہیں تو اس پہ تحقیق بھی ویسے نہیں ہوئی جیسے ہونی چاہیے تھی۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ ڈاکٹروں کے پاس دوسری بیماریوں کی نسبت اس کے بارے میں کم معلومات ہیں، علاج کامیاب ہوگا یا نہیں، یہ بھی سب ہوا میں ہے، اور میں ...... میں بس دواؤں اور تجربوں کے کھیل کا ایک حصہ ہوں۔

یہ میرا کھیل نہیں تھا بھائی، میں تو ایک فل سپیڈ والی بلٹ ٹرین میں سوار تھا، میرے تو خواب تھے، کچھ کام تھے جو کرنے تھے، کچھ خواہشیں تھیں، کچھ ٹارگٹ تھے، کچھ تمنائیں تھیں، آرزوئیں تھیں، اور میں بالکل ان کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ اب کیا ہوتا ہے کہ اچانک پیچھے سے کوئی آکر میرے کندھا تھپتھپاتا ہے، میں جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ ٹکٹ چیکر ہے: ''تمہارا سٹاپ آنے والا

ہے بابو، چلو اب نیچے اترو‘‘۔ میں ایک دم پریشان ہو جاتا ہوں: ’’نہیں نہیں بھائی میاں، میری منزل ابھی دور ہے یار‘‘۔ اور پھر ٹکٹ چیکر مجھے سمجھانے والے انداز میں کہتا ہے: ’’نہ، یہی ہے، سٹاپ تو بس یہی ہے، ہو جاتا ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے‘‘۔

اس اچانک پن میں پھنس کے مجھے سمجھ آ گئی کہ ہم سب کس طرح سمندر کی بے رحم لہروں کے اوپر تیرتے ایک چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے کی طرح ہیں۔ بے یقینی کی ہر بڑی لہر کے آگے ہم تو بس اپنے چھوٹے سے وجود کو سنبھالنے میں لگے رہتے ہیں۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ ہرا سمندر گوپی چندر، بول میری مچھلی، کتنا پانی، اتنا پانی! تو بس پانی، بے رحم پانی، وقت کی موجوں کے تھپیڑوں میں تیرتی نامعلوم ہستی اور پانی!

اس مصیبت میں پھنسنے کے بعد ایک دن جب میں ڈرا سہا ہوا ہسپتال جا رہا تھا تو میں نے اپنے بیٹے سے ایویں بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ مجھے اس وقت اپنے آپ سے کچھ نہیں چاہئے، ہاں بس اتنا ضرور ہے کہ یار اس عذاب سے میں اس طرح نہ گزروں جیسے اب اس وقت گزر رہا ہوں۔ مجھے اپنا سکون اپنا اطمینان واپس چاہیے۔ یہ جو ڈر، جو خوف، جو پریشانیاں میرے کندھوں پہ چڑھی بیٹھی ہیں میں انھیں اٹھا کے پھینک دینا چاہتا ہوں، میں ایسی قابل رحم قسم کی ہونق حالت میں اب مزید نہیں رہنا چاہتا۔ اس بیماری کا شکار ہونے کے بعد میری واحد خواہش یہی تھی۔ اور پھر اپنی تکلیف کی طرف میرا دھیان چلا گیا۔ مطلب اتنے عرصے سے میں بس اپنی تکلیف جھیل رہا تھا، برداشت کر رہا تھا، درد کی شدت کا احساس کر رہا تھا، لیکن اس پوری مدت میں کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ کوئی ہمدردی، پیار بھرے بول، کوئی ہمت بندھانے والی بات، کچھ بھی نہیں! اس وقت پتا ہے کیسا لگتا تھا؟ جیسے پوری کائنات صرف ایک چیز کا روپ دھار چکی ہے، درد، خوفناک درد۔ وہ درد جو ہر چیز سے بڑا ہے!

ہر چیز سے مایوس ہو کر تھکا ہارا، بے حال جب میں ہسپتال کے اندر داخل ہو رہا تھا تو سامنے کی طرف میری نظر پڑی۔ ادھر لارڈز کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ وہ لارڈز جسے دیکھنا میرے بچپن کی سب سے بڑی حسرت تھا۔ اور اب اس تکلیف کے دوران وہاں لگا ویوین رچرڈز کا ایک بڑا سا ہنستا ہوا پوسٹر بھی مجھے اپنی طرف کھینچ نہیں سکا۔ دنیا تو جیسے اب میرے کام کی رہ ہی نہیں گئی تھی۔ خیر، اس ہسپتال میں ایک کوما وارڈ بھی تھا، وہ سارے مریض جو لمبے عرصے کے لیے ہوش اور بے ہوشی بلکہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوتے تھے، وہ ادھر رکھے جاتے تھے، اوپر، بالکل میرے وارڈ کے اوپر والے کمرے میں۔

ایک دن میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا تو جیسے ایک جھماکا ہوا۔ گیم آف لائف اور گیم آف ڈیتھ کے بیچ میں ہے کیا؟ ایک سڑک؟ (کرکٹ کو گیم آف لائف بھی کہتے ہیں) ایک طرف ایک ہسپتال ہے اور اس کے بالکل سامنے دوسری طرف ایک سٹیڈیم، اور دونوں میں کھیلے جانے والے کھیل کی ایک چیز کامن ہے، بے یقینی۔ نہ لارڈز سٹیڈیم میں پتہ ہے کہ اگلی گیند پہ کیا ہوگا، نہ ہسپتال میں اگلی سانس کا پتہ ہے۔ کامل بے یقینی۔ یہ فیلنگ جیسے میرے اندر اتر گئی۔

اب مجھے کائنات کی وسعت، اس کی طاقت اور اس کا نظام، سب کچھ کہیں نہ کہیں سمجھ آنا شروع ہو گئے تھے۔ آخر میرا ہسپتال ایک کھیل کے میدان کے سامنے کیوں تھا؟ اور صرف میں نے ہی اس بات کو اتنی شدت سے محسوس کیوں کیا؟ یہ سب مجھے آپس میں جڑا ہوا لگنے لگا۔ تو سمجھو کہ بس جو چیز یقینی ہے وہ بے یقینی ہے۔ یعنی بے یقینی کے علاوہ اس پوری کائنات میں کچھ بھی ایسا نہیں جسے یقینی کہا جا سکے۔

اب جب سبھی بے یقینی کے بہاؤ میں ہیں تو میں کیا اور میری بے یقینی کیا؟ مجھے تو بس اپنی باقی رہ جانے والی طاقت کو سنبھالنا ہے اور اپنے حصے کا کھیل اچھے سے کھیلنا ہے، دیٹس اٹ! تو بس اس ایک لمحے کے بعد مجھے سمجھ آ گئی۔ میں جان گیا کہ نتیجہ جو بھی نکلے مجھے اس حقیقت کو ماننا ہوگا۔ ادھر

سب کچھ ایسا ہی ہے۔ چاہے میرے پاس آٹھ مہینے بچے ہیں، چاہے دو ماہ یا بے شک دو مزید سال، سب کچھ ایک طوفانی لہر میں ہے۔ اس کے بعد تمام خدشے، تمام ڈر، تمام خوف، تمام پریشانیاں سب کچھ دھندلے ہوتے گئے اور میرا دماغ ان سب سے خالی ہو گیا۔

ساری عمر میں پہلی بار تب مجھے اندازہ ہوا کہ آزادی کا مطلب واقعی میں ہے کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے مجھے کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ جیسے زندگی کا جادو بھرا ذائقہ مجھے پہلی بار چکھنے کو ملا ہے اور یہ سب میرے جسم کی ایک ایک پور میں اتر چکا تھا۔ اس پوری بیماری کے دوران لوگ میرے لیے دعائیں کرتے رہے ہیں، لوگ جنہیں میں جانتا ہوں، لوگ جنہیں میں نہیں بھی جانتا، وہ سب مختلف جگہوں پہ، مختلف ٹائم زونز میں رہتے ہوئے میرے لیے دعائیں کرتے رہے اور مجھے لگا کہ ان کی سب دعائیں مل کے ایک ہو گئیں۔

ایک بڑی سی طاقت، جیسے ایک لہر کی، بڑی سی موج کی طاقت ہوتی ہے، وہ بس ریڑھ کی ہڈی سے میرے اندر تک اتر گئی اور میری کھوپڑی کے اندر اس نے اپنی جڑیں بنا لیں۔ اب وہ ادھر اگتی رہتی ہے، کبھی ایک چھوٹا سا امید کا پودا، کبھی ایک پتا، کبھی ایک نرم سا تنا۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا رہتا ہوں۔ اتنی ساری دعاؤں کے نتیجے میں اس پہ جو بھی پھول اگتا ہے، جو بھی نئی ٹہنی نکلتی ہے، جو بھی پتا آتا ہے، وہ مجھے صرف خوشگوار سی حیرت اور خوشیاں دیتا ہے۔ تو وہ جو لکڑی کا ننھا سا ٹکڑا ہے نا، اسے کیا ضرورت کہ وہ پانی کے بہاؤ کا رخ بدلنے کی کوشش کرے؟ اسے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہم سب قدرت کی گود میں بیٹھے ہیں جو ہمیں ہلکے پھلکے جھولے دے رہی ہے، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کچھ بھی کم، دیٹس اٹ"۔

[مترجم حسنین جمال، بشکریہ www.humsub.com.pk]

ابو یحییٰ

کیا عقل قرآن کو سمجھنے سے قاصر ہے؟

سوال: السلام علیکم۔ سر آپ سے ایک مدد چاہیے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ہماری عقل قرآن کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ فلسفے نے بھی بات کو تسلیم کرلیا کہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی ایک مقام پر عقل بھی ساتھ دینا چھوڑ دیتی ہے۔ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں کیوں نہیں جلے۔ اس کی چند مزید مثالیں یہ ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا۔ حضرت موسی علیہ السلام کے عصا کا اژدہا بن جانا۔ دریائے نیل کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا۔ خضر علیہ السلام اور موسی علیہ السلام کا سفر۔ وغیرہ وغیرہ۔ سر اس ضمن میں آپ مجھے کیا سجیسٹ کریں گے؟ ،فراز لاشاری۔

جواب: محترم فراز لاشاری صاحب!

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔ برادر محترم دو چیزوں کا فرق سمجھ لیں۔ ایک یہ کہ کسی بات کا سمجھ میں آنا اور ایک ہے کسی چیز کی حقیقت سے واقف ہو جانا۔ پہلی چیز کے لیے ہماری عام سمجھ بوجھ کافی ہے۔ البتہ دوسری چیز ضروری نہیں کہ ہر کسی کی عقل میں آسکے۔ مگر زندگی گزارنے اور حقائق کو ماننے کے لیے پہلی چیز ہی کافی ہے، دوسرے کی ضرورت نہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ مرد و عورت کے ملاپ سے ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ مشاہدات پر مبنی ہے۔ مگر اس کی حقیقت کا گرفت میں آنا ہر شخص کے لیے جدا ہو گا۔ ایک عامی یہی کہے گا کہ انسان نطفے سے جنم لیتا ہے۔ دوسری طرف ایک سائنسدان وہ پورا پروسس بتادے گا جو آج کی سائنس نے دریافت کرلیا ہے، مگر روح کیسے آتی ہے یہ وہ بھی نہیں بتا سکے گا۔

اس روشنی میں جب قرآن کے ان جیسے تمام بیانات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کا آپ نے

حوالہ دیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حوالے سے پہلی بات یعنی سمجھ میں آنے میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مسئلہ دوسری بات میں ہے کہ اس کی حقیقت یا دوسرے الفاظ میں اس کی سائنس یا پروسیجر ہمارے ادراک سے بلند ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اہمیت سمجھ میں آجانے کی ہے۔ رہی دوسری بات یعنی حقیقت کا گرفت میں آجانا تو اس میں قرآن کے حقائق ہی نہیں زندگی کے دیگر بیشتر حقائق کی نوعیت بھی ہم پر مکمل طور پر واضح نہیں ہوتی۔ جیسے یہ ای میل آپ پڑھ لیں گے۔ مگر اس کو آپ تک پہنچانے میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی استعمال ہوئی ہے وہ آپ نہیں جانتے، مگر کیا آپ اس حقیقت کا انکار کردیں گے کہ میں نے یہ ای میل آپ کو دیا ہے یا آپ میرے جواب کو چھوڑ کر اس پر بحث شروع کردیں گے کہ پہلے انٹرنیٹ کے کام کرنے کا طریقہ بتاؤ پھر تمھاری بات مانوں گا۔ ظاہر ہے کہ آپ یہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ معاملہ قرآن تک ہی محدود نہیں زندگی کے ہر معاملے میں ہم حقائق کو سمجھ میں آنے کی بنیاد پر مانتے ہیں نہ کہ اسے چھوڑ کر ہر واقعے کی حقیقت، نوعیت، سائنس اور طریقہ کار کی جزئیات کی بحث میں لگ جاتے ہیں۔ یہ ایک علمی غلطی ہے۔ امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

والسلام علیکم

بندہ عاجز

ابویحییٰ

ارطغرل ڈرامہ اور ابویحییٰ

سوال:

ارطغرل غازی ڈرامے پر آرٹیکل میں آپ نے خود کہا ہے کہ اس ڈرامے میں دین، ایمان اور اِخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اس ڈرامے میں فحاشی بھی نہیں ہے اور نہ عورتوں کو عریاں لباس

میں دکھایا گیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستانی ڈراموں میں بے حد فحاشی اور بیہودہ ڈائیلاگ کی بھرمار ہوتی ہے۔ ڈرامہ تو چھوڑو نیوز چینل بھی لگاؤ تو ایسے واہیات ایڈ آتے ہیں کہ نیوز چینل بھی دیکھنے کا دل نہیں کرتا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ آپ صرف اس ڈرامہ کو لے کر اتنا لکھ رہے ہیں؟ اور آپ کی کوشش بتا رہی ہے کہ آپ نہیں چاہتے کہ آج کی نسل پُرانی روایات دیکھیں اور سیکھیں۔ آپ نے کبھی پاکستانی ڈراموں پہ اتنا کیوں نہیں لکھا؟ فضہ بریرو

جواب: السلام علیکم

ارطغرل ڈرامے کے حوالے سے میری سائٹ اور فیس بک پر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

جو لوگ ارطغرل ڈرامہ دیکھنا چاہیں، وہ ضرور دیکھیں۔ اس ڈرامے کو انجوائے کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ اپنی تاریخ اور ماضی پر فخر کرنا چاہیں تو یہ بھی ضرور کریں۔ مگر مہربانی کر کے اس کو حال سے متعلق نہ کریں۔ ورنہ دو صدیوں سے شکستوں کا جو سلسلہ جاری ہے وہ اس صدی میں بھی جاری رہے گا۔ ہو سکے تو اس طالب علم کے بیان کردہ یہ نکات ضرور ذہن نشین کر لیں۔ انھی میں ہمارے عروج کا راستہ پوشیدہ ہے۔

میرے ان الفاظ کے بعد آپ اپنے سوال پر غور کیجیے کہ کیا یہ سوال کسی حقیقت پر مبنی ہے یا محض آپ کا تاثر ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ میرے پورے مضمون میں ایک جملہ بھی نہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ مصنف کی کوشش ہے کہ لوگ ڈراما نہ دیکھیں۔ میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کبھی کسی کتاب، ڈرامے، عالم، کسی فرد یا گروہ کے خلاف لکھ کر لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کی کوشش کروں۔ میرے نزدیک یہ ایک انتہائی پست اور گھٹیا حرکت ہے جس کے ارتکاب کا تصور کوئی صالح انسان نہیں کر سکتا۔

جو کام دین کے ایک طالب علم اور ملت کے ایک خیر خواہ کے طور پر میں کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی فکر یا نقطہ نظر یا رویے کی غلطی کو واضح کر دیا جائے۔ ارطغرل ڈرامے پر لکھنے کی وجہ بھی ڈرامے پر تبصرہ کرنا نہیں تھا نہ یہ میرا کام ہے کہ ڈراموں پر تبصرہ کروں۔ میرا اصل مقصد مسلمانوں میں پھیلے ہوئے ان غلط تصورات پر تبصرہ کرنا تھا جس کی بنا پر پچھلی دو صدیوں سے مسلمان برباد ہو رہے ہیں اور اس بربادی کی آخری قسط تو ابھی بھی جاری ہے۔

یہ تصورات کیا ہیں ان کا خلاصہ بھی سن لیں۔ پہلا یہ کہ ایک عظیم لیڈر آئے گا اور وہ سب ٹھیک کر دے گا۔ میں نے توجہ دلائی ہے کہ عظیم لیڈر کے انتظار کے بجائے ہمیں افراد کی تربیت کر کے معاشرے کو مجموعی طور پر بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسرا تصور یہ کہ مسلمان اس لیے تباہ ہوئے کہ انھوں نے تلوار کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ میں نے یہ واضح کیا ہے کہ دور حاضر میں مسلمانوں کی شکست کا سبب یہ نہیں کہ انھوں نے تلوار کو چھوڑ دیا بلکہ یہ ہے کہ وہ تعلیم اور علم میں دنیا میں سب سے پیچھے ہیں۔ تیسرا تصور یہ ہے کہ ہم اس لیے تباہ حال ہیں کہ ہمارے خلاف ہر وقت سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں نے توجہ دلائی ہے کہ دوسری قومیں اپنی سازشوں سے نہیں بلکہ علم واخلاق میں اپنی خوبیوں کی بنا پر ہم سے آگے بڑھی ہیں اور ہم خود میں یہ خوبیاں پیدا کرنے کے بجائے سازشوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔

ایک اور چیز جس کی طرف اپنی یوٹیوب وڈیو میں توجہ دلائی یہ حقیقت تھی کہ ہم ایمان واخلاق میں اپنی کوتاہیوں کی بنا پر اس وقت حالت سزا میں ہیں۔ اس وقت کرنے کا اصل کام اپنی اصلاح اور بحیثیت مسلمان ایمان، اخلاق اور دعوت کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ اس کے بغیر ہماری ہر کوشش ملیا میٹ ہو کر رہے گی اور دو سو برس سے مسلسل ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت چونکہ ان معاملات میں اپنی اصلاح پر تیار نہیں، اس لیے ان پر متنبہ کرنا میرا دینی اور ملی فریضہ تھا۔ الحمدللہ بیشتر لوگوں نے بات سنی اور سمجھی۔ یہ روشنی ان شاءاللہ ایسے

ہی آگے بڑھے گی۔ البتہ بہت سے لوگوں نے بہت کچھ برا بھلا بھی کہا۔ مگر اس راہ میں سب وشتم جھیلنا اور برا بھلا سننا ان انبیا کی سنت ہے جن کے پاؤں کی خاک برابر بھی ہم نہیں ہوسکتے۔ اس راہ میں جو ہفوات سننی پڑتی ہیں، اس کے بدلے میں ان اعلیٰ ترین شخصیات کے قدموں میں جگہ مل جائے تو یہ برا سودا نہیں ہے۔ علم واخلاق سے عاری یہ لوگ اپنا کام کرتے رہیں۔ ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔ زیادہ وقت نہ گزرے گا کہ اللہ رب العالمین خود فیصلہ کر دیں گے کہ کون ان کے نبیوں کے طریقے پر تھا اور کون قوم پرستی، فرقہ واریت خواہش پرستی کے راستے پر تھا۔

والسلام علیکم

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے سمجھایا، (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مظلوم کی مدد تو میں کر سکتا ہوں، لیکن اگر بھائی ظالم ہو تو اس کی مدد کس طرح کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو ظلم کرنے سے روک دو۔ (بخاری، مسلم)

ابو یحییٰ

قرآن کی ہدایت

رمضان کا مہینہ آتا ہے تو عام طور پر لوگوں کا رجوع قرآن مجید کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ قرآن سے تعلق تو کم و بیش ہر روزہ دار قائم کر لیتا ہے۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو رمضان میں پورا قرآن مجید ختم کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔ ایسے میں ہمارے ہاں ایک اہتمام یہ کیا جاتا ہے کہ تراویح میں قرآن مجید کا ترجمہ یا تلخیص کر کے اس کا مدعا و مفہوم بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض لوگ خود بھی قرآن مجید کو ترجمے سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ سارے اہتمام اپنی جگہ مفید ہیں لیکن قرآن مجید کو سمجھنے سے قبل اگر اس کتاب کی درست نوعیت اور اس کے اصل مطالبات کو سمجھ لیا جائے اور ساتھ ہی ان اہم شخصی خصوصیات کو جان لیا جائے جو قرآن مجید پیدا کرنا چاہتا ہے تو رمضان میں قرآن مجید کے مطالعے کا عمل اپنی افادیت میں کئی گنا بڑھ سکتا ہے۔ اس پس منظر میں آج یہ کوشش کی جائے گی کہ اگلی سطور میں انھی چیزوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ واضح کیا جائے۔ تاکہ قارئین کا مطالعہ قرآن ان میں وہ تبدیلیاں پیدا کر دے جو نزول قرآن کا اصل مقصد ہے۔

قرآن مجید کی نوعیت

قرآن مجید تئیس برس کی مدت میں نازل ہوا، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آیات کو سورتوں اور پھر سورتوں کو ایک منظّم کتاب کی شکل میں مرتب کر کے امت کو دیا تھا۔ اب یہی کتاب تا قیامت انسانیت کے لیے رہنمائی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نزول قرآن کے وقت اس کی نوعیت کیا تھی اور اب ابدی طور پر یہ انسانیت کے لیے کس طرح رہنما ہے۔

قرآن مجید بلاشبہ انسانوں کے لیے ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان موت کے بعد کس مسئلے سے دوچار ہونے والے ہیں اور موجودہ دنیا میں وہ کیا طریقہ ہے جسے اختیار کر کے انسان آنے والی زندگی کے مسائل سے بچ کر ابدی فلاح پا سکتے ہیں۔تاہم قرآن کی یہ حیثیت بھی ہے کہ اپنے اولین مخاطبین کے لیے ہدایت ہونے کے ساتھ یہ عدالت بھی تھا۔

اس عدالت والی بات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے اولین مخاطبین کو موت کے بعد آنے والی زندگی، وہاں ہونے والی جزاوسزا اور اس جزاوسزا کی اساسات ہی سے آگاہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے لیے سرزمین عرب میں خدا کی وہ عدالت عملاً لگا دی تھی جو باقی انسانیت کے لیے قیامت کے دن لگے گی۔یعنی قرآن میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ جو لوگ قرآن مجید کی دعوت پر ایمان لائیں گے وہ انعام کے طور پر اس سرزمین کے حکمران بنا دیے جائیں گے اور جو لوگ اس کا کفر کریں گے، بطور سزا ان پر ذلت اور مغلوبیت کا عذاب مسلط کر دیا جائے گا۔

قرآن کے مضامین اور اہل عرب کے لیے جزاوسزا

قرآن مجید کا دو تہائی حصہ مکہ میں نازل ہوا۔اس حصے میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے شرک، ان کی بدعتوں اور گمراہیوں پر تنقید کر کے انھیں توحید وآخرت کی اس دعوت پر ایمان لانے کے لیے کہتے ہیں جسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ساتھ میں اس دعوت کے دلائل، ماننے والوں کے لیے جزا کا بیان اور نہ ماننے والوں کے لیے ابدی سزا کا بھی تفصیلی بیان ہے۔ پھر منکرین جو اعتراضات، سوالات اور شبہات اٹھا رہے تھے، ان کا جواب بھی دیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ جس طرح پچھلی قومیں اپنے رسولوں کے کفر و انکار کے نتیجے میں تباہ ہوئیں، اسی تباہی کا سامنا اب مشرکین عرب کو کرنا ہوگا۔سوائے ایمان لانے والوں کے جنھیں اس دنیوی عذاب سے بچا لیا جائے گا۔

کفار مکہ پر اتمام حجت کے بعد یعنی حق کی دعوت کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم پر مدینہ ہجرت کی۔مدینہ میں جو قرآن نازل ہوا اس میں ایک طرف یہی اتمام حجت یہود و نصاریٰ پر کر کے ان کو دعوت حق پہنچائی گئی، دوسری طرف مسلمانوں

کے مدینے میں ایک امت اور ریاست کے طور پر منظّم ہونے کے بعد انھیں شریعت کا قانون عطا کیا گیا۔ ساتھ میں کفار مکہ پر صحابہ کی تلواروں کے ذریعے سے سزا نافذ کی گئی۔ اہل کتاب اور منافقین کو ان کی بدعملیوں پر مسلسل تنبیہات کر کے ان کی سزا کا بھی فیصلہ سنایا گیا۔

اس سزا کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مشرکین کو یا تو اسلام قبول کرنا تھا ورنہ موت کے سوا ان کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ جبکہ اہل کتاب کو مغلوبیت کی سزا سنائی گئی۔ البتہ منافقین کی سزا ان کے ظاہری ایمان کی بنا پر قیامت تک کے لیے موخر کی گئی لیکن دنیا میں ان کے لیے بدترین رسوائی کے ساتھ ان کا زور بھی توڑ دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو سرزمین عرب پر مکمل غلبہ اور اقتدار دے دیا گیا۔

اس داستان کا اصل سبق

یہ پوری داستان قرآن مجید میں بکھری ہوئی ہے۔ مگر قرآن مجید کے ابتدائی ایک تہائی حصے میں اس کو بالاجمال اور باقی دو تہائی قرآن میں بالتفصیل بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن کی ابتدا سے لے کر سورہ مائدہ تک قرآن پڑھنے والوں کو یہود و نصاریٰ اور منافقین پر اتمام حجت کی داستان مل جاتی ہے اور اس کے بعد آنے والی سورہ توبہ اور اعراف میں مشرکین عرب پر اتمام حجت اور پھر سورہ انفال اور توبہ میں اس سزا کا بیان ہے جو مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کو سنائی گئی۔ جبکہ باقی دو تہائی قرآن میں قرآن کی دعوت و دلائل اور انذار و تبشیر کا تفصیلی بیان ہے۔

قرآن میں موجود اس پوری دعوت کا بنیادی سبق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعوت ایمان صرف ایک نظریاتی معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح اِس دنیا میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل سرزمین عرب میں خدا کی یہ عدالت لگی اور اس عدالت میں کفار کو ہلاکت اور مغلوبیت کی سزا سنائی گئی اور اہل ایمان کو جو غلبہ و اقتدار دے دیا گیا، ٹھیک اسی طرح خدا کی عدالت آنے والی دنیا میں لگے گی اور اہل ایمان کو ابدی طور پر فردوس کی ابدی بادشاہی کا تاج پہنایا جائے گا۔ جبکہ منکرین کے حصے میں سوائے جہنم کے کچھ نہ آئے گا۔

یہ داستان محض ایک داستان نہیں بلکہ معاصر تاریخ نے اس پورے واقعے کو ریکارڈ کیا ہے اور مسلمہ

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک تنہا شخص نے سرزمین عرب میں اپنی دعوت شروع کی اور تیئس برس کی مدت میں وقت کے فرعون نہ صرف ہلاک ہوئے بلکہ وہ ماننے والے جو ابتدا میں گنتی کے تھے اور ستائے جارہے تھے، کس طرح وہ دنیا کے حکمران بن گئے۔ کوئی قرآن کو مانے نہ مانے، وہ اس تاریخی حقیقت کا کبھی انکار نہیں کرسکتا جو ایک ثابت شدہ مسلمہ ہے۔ یہی قرآن کی سچائی اور پیغمبر اسلام کی حقانیت کا وہ ثبوت ہے جس کا کوئی بدترین منکر بھی انکار نہیں کرسکتا۔

قرآن کی ابدی تعلیم: ایمانیات اور ان کے دلائل

یہ جزا وسزا جو قرآن کے اولین مخاطبین کے لیے برپا ہوئی تھی، یہ باقی دنیا کے لیے نہیں ہے۔ باقی دنیا کی جزا وسزا اب روز قیامت برپا ہوگی۔ لیکن ان کے لیے بھی قرآن تا قیامت اسی طرح ہدایت ہے جس طرح اہل عرب کے لیے تھا۔ یہی ہدایت قرآن مجید کی ابدی تعلیم ہے۔

اس ہدایت کی اساس ایمان ہے۔ یعنی تنہا ایک اللہ پر ایمان، آخرت کی دنیا جنت اور جہنم پر ایمان۔ کتابوں، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان۔ یہ دین حق کے وہ ایمانیات ہیں جن کو مانے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں یہ ایمانیات ڈنڈے کے زور پر نہیں منوائے گئے بلکہ اس کے بہت سے عقلی وفطری دلائل دیے گئے ہیں جن سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ اللہ ایک ہے، تنہا وہی عبادت کے قابل ہے، موت کے بعد زندگی برحق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں؛ ان ایمانیات کے عقلی وفطری دلائل سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔

مثلاً یہ بات کہ اللہ ہی تنہا معبود ہے، اس کی دلیل کے طور پر جگہ جگہ مظاہر کائنات کو پیش کیا گیا ہے۔ زمین وآسمان کی یہ تمام نشانیاں گواہی دیتی ہیں کہ نہ یہ خود بخود وجود میں آسکتی ہیں نہ کوئی انسان، کوئی بت یا کوئی اور مخلوق ان کو بنا سکتی ہے۔ یہ صرف اللہ کی ہستی ہے جو تنہا خالق و مالک ہے اور اسی لیے وہی عبادت کے لائق ہے۔

حیات بعد از ممات کی ایک دلیل یہ بیان ہوئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسانوں کو پہلی دفعہ پیدا کرسکتے ہیں تو دوبارہ کیوں نہیں کرسکتے۔ رسالت کی یہ دلیل بیان ہوئی ہے کہ حضور چالیس برس تک اپنی قوم میں ایک تاجر کی حیثیت سے رہے، مگر کبھی کوئی شعر تک نہ کہا۔ مگر ایک روز اچانک وہ

کلام پیش کر دیا جس نے پورے عرب کو لا جواب کر دیا۔ یہ کام کوئی انسان نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ خدا کسی پر کوئی وحی کرے۔ ہم نے بطور نمونہ تین بنیادی ایمانیات کی ایک ایک دلیل کو بیان کیا ہے، وگرنہ ان جیسے متعدد دلائل قرآن مجید میں توحید، آخرت اور رسالت کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔

قرآن کی ابدی تعلیم: اخلاقیات اور شریعت

قرآن کی بیان کردہ ابدی تعلیم کا دوسرا پہلو اس کے اخلاقی تقاضے ہیں جو وہ اپنے ماننے والوں کے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اخلاقی تقاضے تین چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے خالق کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور ان کو کیسے ادا کیا جائے۔ دوسرے مخلوق کے ہم پر کیا حقوق ہیں۔ جبکہ اخلاقیات کا تیسرا حصہ مرد و زن کے درمیان تعلق میں زنا کی ناپاکی کو در آنے سے روکتا ہے کیونکہ اسی پر خاندان اور پورے معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

ان اخلاقی تقاضوں میں بعض مقامات پر انسانوں کی مزید رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کچھ قانون سازی کی ہے۔ اس قانون سازی میں ایمان و اخلاق کے بعض تقاضوں کا وقت اور طریقہ کار وغیرہ متعین کر دیا گیا ہے۔ جیسے خدا کی یاد ایمان کا ایک تقاضا ہے۔ عبادات کے قانون ذریعے سے اس یاد کا ایک منظّم طریقہ بتا دیا گیا ہے۔ اسی طرح عدل ایک اخلاقی تقاضا ہے۔ مگر انسان اولاد کے درمیان بھی عدل نہیں کر پاتا۔ چنانچہ وراثت کا قانون دیا گیا۔ ان کے علاوہ معاشرت، معیشت، سیاست، جہاد، حدود و تعزیرات اور بعض دیگر پہلوؤں سے بھی شریعت کا قانون دیا گیا ہے۔ ان قوانین میں کچھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور کچھ کی تفصیل سنت میں ملتی ہے۔ ایمان، اخلاق اور شریعت کی یہی رہنمائی دین کی ابدی تعلیم ہے۔

اس کے بعد قرآن میں ایک اہم چیز وہ انذار و تبشیر ہے جو اس ہدایت کو اختیار کرنے والوں کو کیا گیا ہے۔ یعنی جنت کی ابدی بادشاہی کا تفصیلی بیان ہے یا جہنم کے ان عذابوں کی تفصیل ہے جو منکرین کو دیے جائیں گے۔

قرآنی رہنمائی سے پیدا ہونے والے شخصی اوصاف

قرآن مجید ایمان، اخلاق اور شریعت کی ان تعلیمات سے ایک پاکیزہ شخصیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ جنت ایسے ہی پاکیزہ نفوس کے رہنے کی جگہ ہے۔ شخصیت کی اس پاکیزگی کے ساتھ کچھ اور شخصی اوصاف ہیں جو قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے بیانات کو ان کی پوری روح کے ساتھ سمجھنے اور اختیار کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ قرآن مجید کو پڑھنے والا شخص سب سے بڑھ کر خدا سے محبت کرنے والا بن جاتا ہے۔ خدا کی ہستی اس کے لیے سب سے زیادہ اہم بن جاتی ہے۔ وہ خدا کے لیے جیتا اور اسی کے لیے مرتا ہے۔ وہ اپنے رب کی ناراضی سے ڈرتا بھی ہے اور اسی سے امید اور توکل بھی رکھتا ہے۔ خدا اس کی زندگی کا مرکزی خیال بن جاتا ہے۔ تنہا اسی کی عبادت، اس کی اطاعت اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ گہرا، ذاتی اور براہ راست تعلق اگر کسی شخص میں پیدا نہیں ہو رہا تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے قرآن کو اس کی اصل روح کے ساتھ نہیں پایا۔

مطالعہ قرآن کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے حقوق کی ادائیگی میں بہت محتاط ہو جاتا ہے۔ عدل، احسان، انفاق، ایثار اس کی زندگی کا لازمی جز ہوتا ہے اور فواحش، منکر اور ظلم و زیادتی سے وہ ہمیشہ دور رہتا ہے۔ عہد و امانت کی پاسداری اس کی زندگی ہوتی ہے اور سرکشی و تکبر سے اس کی زندگی کوسوں دور ہوتی ہے۔

قرآن مجید کو تدبر سے پڑھنے والے شخص کا ایک اور وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ دلائل کی بنیاد پر بات سمجھتا اور دلائل ہی کی بنیاد پر آراء قائم کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن جب نازل ہوا تو اس نے اپنا انکار کرنے والوں کو عقل و فطرت کے دلائل دیے تھے۔ جبکہ مخالفین کے پاس جذباتیت اور تعصب کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کا مومن نہ متعصب ہوتا ہے نہ جذباتی بلکہ وہ ایک معقول انسان بن جاتا ہے۔

مطالعہ قرآن کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایمان انسان کو مثبت ذہن عطا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایمان اس خدا پر ایمان ہوتا ہے جو بہت رحیم اور کریم ہے۔ جس کے ہر کام میں خیر ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت کی اس فلاح کی طرف بلاتے ہیں جو گرچہ ایک مشکل جدوجہد کے بعد ملے گی

،مگر ملے گی تو انھیں نہال کردے گی۔ چنانچہ جس طرح ایک اچھا طالب علم امتحان کے زمانے کی مشکلات کو مثبت ذہن کے ساتھ یہ سوچ کر برداشت کرتا ہے کہ آگے ملنے والی کامیابی بہت اہم ہے، اسی طرح بندہ مومن کا ایمان دنیا کی ہر مشکل اور ہر مسئلے میں اسے مثبت سوچ عطا کرتا ہے۔

ایک اور اہم وصف جو قرآن کریم انسان میں پیدا کرتا ہے وہ اعتدال اور توازن کا ذہن ہے۔ دین کی تعلیمات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی جان پر اس کی ذمہ داری سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔ یہاں ہر معاملے میں اعتدال اور توازن ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص نیکی میں آگے بڑھنا چاہے اور دین کو جمال و کمال کی سطح پر اختیار کرنا چاہے تو اس کے لیے نوافل، تطوع عبادات، ایثار اور قربانی کا راستہ کھلا ہے۔ مگر یہ لوگوں کی اپنی صوابدید ہے۔

اس ضمن کی ایک آخری اہم چیز یہ ہے کہ قرآن ہر جگہ اپنے احکام کی حکمتیں بیان کرتا اور ظاہری احکام کے پیچھے پوشیدہ اصل حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کو ظاہر پرستی سے بچاتی ہے اور انسان کا اصل فوکس ہمیشہ دین کی حقیقت، روح اور مقصد کی طرف رہتا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کو غور و فکر کے ساتھ پڑھنے والے لوگ ان تمام خصوصیات کو اپنے اندر رفتہ رفتہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ قرآن میں قرآن ہی کو پڑھیں۔ انسانی کمزوری یہ ہے کہ وہ قرآن پڑھتے وقت اپنے نظریات کو ذہن سے نہیں نکالتے بلکہ قرآن میں بھی ان ہی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن ایسے لوگوں پر اپنے دروازے بند کر دیتا ہے۔ وہ قرآن تک اپنا فکر لے کر آتے ہیں اور نتیجے کے طور پر اپنا فکر ہی لے کر جاتے ہیں۔ قرآن کے خوان سے ان کو رزق ربانی کا کوئی حصہ نصیب نہیں ہوتا۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ قرآن پڑھنے آئیں تو اپنے قومی، سیاسی، فرقہ وارانہ اور فکری تصورات کو چھوڑ کر آئیں۔ تب ہی قرآن سے انھیں وہ ملے گا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

جہاں رہیے بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بن کر رہیں، باعث آزار نہ بنیں۔

شفقت علی

بچوں کی تربیت کے مختلف پہلو

والدین بننے کے بعد اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بچوں کی تربیت کرنے کا مطلب انھیں چند ایک آداب سکھانا، تمیز کا دائرہ بتانا، دوسروں کا احترام سکھانا، نماز پڑھنے اور سچ بولنے کی ترغیب دینا وغیرہ ہی ہے۔ مگر یہ سب باتیں تربیت کا صرف ایک پہلو ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تربیت ایک ہمہ جہت پہلو ہے۔ یہ درست ہے کہ اخلاق و آداب تربیت میں اولیں حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بچے کی تربیت کے دیگر پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً ہمیں اپنے بچوں میں شخصی خوبیاں بھی پیدا کرنی چاہئیں۔ یعنی بچوں میں خوداعتمادی، خود تنظیمی اور خود آگہی بھی پیدا کرنی چاہیے۔ اسی طرح بچوں کو وقت کی تنظیم کرنا اور پیسے خرچ کرنے کا طریقہ سکھانا بھی ضروری ہے۔

اس کے علاوہ بچوں کے جذباتی و نفسیاتی مسائل کو جاننا اور ان کا حل ڈھونڈنا بھی بہت ضروری ہے۔ بچے کے جذباتی و نفسیاتی مسائل میں ضد، اَنا، چڑچڑاپن، خوف (فوبیاز)، احساسِ کمتری، احساسِ برتری، اکیلاپن، شرمیلاپن، بے وجہ اداسی، لوگوں کو دیکھ کر گھبرانا، امتحانات کا خوف، کسی مضمون میں عدم دلچسپی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مسائل کا بروقت علاج نہ ہو تو ان کے بداثرات بچوں کی بقیہ زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔

بچے کی تربیت کا ایک اور نمایاں پہلو اس کے تخلیقی و عقلی پہلوؤں کی تربیت ہے یعنی بچے کو سوچنا، غوروفکر کرنا، مشاہدہ اور تجزیہ کرنا، گفتگو/ مباحثہ کرنا، سوال کرنا اور سوالوں کے جوابات ڈھونڈنا سکھایا جائے۔ بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو کھوجا جائے اور ان کی نشوونما کی جائے۔ بچوں کے تخیل کو اُبھارا جائے اور ان کی جمالیاتی حس کو صحیح رُخ میں پروان چڑھایا جائے۔

شفقت علی

تعلیم کیا ہے

لفظ تعلیم جسے انگلش میں ایجوکیشن لاطینی زبان سے ماخوذ ہے اور اس کا مفہوم باہر نکالنا اور نشوونما کرنا۔ یوں تعلیم کا مطلب بنا: ایسا عمل جس سے فرد کی مخفی صلاحیتوں کو کھوجا جائے اور پھر اُن صلاحیتوں کی نشوونما کی جائے۔ مختلف زمانوں میں بہت سے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کیں۔ مگر ایک خاصیت جو اِن تمام تعریفوں میں یکساں ہے وہ ہے فرد کی ہمہ جہت نشوونما، یعنی فرد کی اخلاقی، روحانی، جسمانی، عقلی اور جذباتی نشوونما کرنا تا کہ وہ ایک ایسا انسان بن جائے جو معاشرے کے لیے مفید ہو۔

حصولِ تعلیم کے دو بنیادی ذرائع ہیں یوں اس کی دو اقسام ہوئیں: رسمی تعلیم اور غیر رسمی تعلیم۔ رسمی تعلیم سکول، کالج اور یونیورسٹیز سے ملتی ہے جب کہ غیر رسمی تعلیم عموماً گھر، محلّہ، خاندان اور مسجد و محفل سے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک ان دو ذرائع نے تربیت اور کردار سازی کو اپنا محور بنائے رکھا تب تک نوجوان بھی 'ملت کے مقدر کا ستارہ' بن کر چمکتے رہے۔ مگر افسوس آج صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں تعلیم کا شعبہ زوال کا شکار ہے اور تربیت کا فقدان ہو گیا ہے۔ تعلیم کے رسمی ادارے طلبا کو صرف مارکس اور گریڈز دلانے کے لیے رہ گئے ہیں تو غیر رسمی ادارے بھی اپنا فرض بھلائے بیٹھے ہیں۔ اب گھر اور خاندان کے بڑے بوڑھے غیر ضروری مصروفیات کا شکار ہیں تو مسجد و محفل میں بھی تربیت اور کردار سازی موضوعِ گفتگو نہیں رہی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ، والدین اور دینی علما مل کر اپنا ذمہ دارانہ کردار ادا کریں تا کہ ہمارے نوجوان معاشرے کا مفید رُکن بنیں اور دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔

شفقت علی

شکر اور تعمیرِ شخصیت

خوشگوار زندگی گزارنا نتیجہ ہے کچھ عادات اپنانے کا جن میں شکرگزاری سرفہرست ہے۔شکرگزاری کیا ہے؟شکرگزاری اصل میں اعتراف ہے جوغوروفکر کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ شکرگزاری ایک جوابی رویہ ہے جوانسان اپنے محسن کے اعزاز میں اپناتا ہے۔شکرگزاری ایک احساس ہے جو بالآخرالفاظ واعمال کے ذریعے اظہار پاتا ہے۔دین کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اورمخلوق دونوں کاشکرگزار بنے۔

خالق کی شکرگزاری کیا ہے؟ خالق کی شکرگزاری یہ ہے کہ اُس کی انمول نعمتوں کااعتراف کیا جائے اورسرکشی سے بچا جائے۔جونہیں ملا اسے نظرانداز کر کے ملی ہوئی اَن گنت نعمتوں کو دریافت کیا جائے۔ان نعمتوں کا جائزاور بہتر استعمال کیا جائے اورانھیں مخلوق کی خیرخواہی کے لیے برتا اور بانٹا جائے۔ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کی یاد میں جیا جائے۔

مخلوق کی شکرگزاری کیا ہے؟ مخلوق کی شکرگزاری یہ ہے کہ اپنے والدین، اساتذہ، بہن بھائیوں، دوستوں، رشتہ داروں اور دیگرلوگوں سے ملنے والی آسانیوں اورمہربانیوں کا اعتراف کیا جائے۔ان تمام سے حُسنِ ظن رکھا جائے، ان کا ذکراچھے الفاظ میں کیا جائے، ان کا شکوہ شکایت نہ کیا جائے، ان کے احسانات کوتمام عمر یاد رکھا جائے، ہوسکے تو اُن کے احسان کا بہتر بدلہ دیا جائے یاکم ازکم اُن کے حق میں دعائے خیرضرور کی جائے۔

شکرگزاری کے بہت سے فائدے ہیں۔ایک شکرگزار بندہ بیک وقت خالق ومخلوق کا پسندیدہ انسان بن جاتا ہے۔شکرگزاری ایک طرف ہمارا خالق سے رشتہ جوڑتی ہےتو دوسری طرف ہمارے معاشرتی تعلقات کوبھی مضبوط بناتی ہے۔ایک طرف یہ ہماراغوروفکر بڑھاتی ہےتو دوسری طرف ہمیں نفسیاتی بیماریوں سے بھی بچاتی ہے۔یوں شکرگزاری کی بدولت انسان نہ صرف ذہنی وروحانی بلکہ مادی ترقی بھی کرتا چلا جاتا ہے۔

خطیب احمد

اسپیڈ بریکر

میری پھوپھو کے گاؤں جاتے ہوئے راستے میں ایک قصبہ ہے جس میں محض 700 میٹر کے اندر گاؤں والوں نے 11 بہت بڑے اور اونچے اسپیڈ بریکر بنا دیے ہیں جو آنے جانے والوں کو انتہائی تکلیف دیتے ہیں۔ آپ ان سے 10 کی اسپیڈ سے بھی گزریں تو اچھل کر سیٹ پر گرے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ کل میں اس گاؤں سے گزرتے ہوئے قدرے کم اسپیڈ سے جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کسی بریکر کو سائیڈ سے توڑا گیا ہے تو کسی کو درمیان سے تا کہ بائیک کا ٹائر آسانی سے گزر جائے۔ میں نے بھی وہ آسانی والی جگہ پہچان لی اور 6 سپیڈ بریکر انتہائی سکون سے بغیر اچھلے عبور کر لیے۔

اب اگر ہم اپنی نماز کی طرف آئیں تو اس کی کہانی بھی ان اسپیڈ بریکروں سے چنداں مختلف نہ ہوگی۔ ہم نماز کو ایک ایکسر سائز کی طرح کر کے اپنے تئیں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا ہوا۔ ہم نماز سے دن میں پانچ بار ایسے گزرتے ہیں جیسے میں اسپیڈ میں ان اسپیڈ بریکروں سے گزر جاتا تھا مگر کبھی اسپیڈ کم کرنے کی کوشش نہ کرتا بلکہ الٹا ان کو اور ان کے بنانے والوں کو کوستا تھا۔ جبکہ یہ نماز سے اسی طرح تیزی سے گزر جانے کا نتیجہ ہے کہ نمازیں پڑھنے کے باوجود نہ ہمارا ظاہر بدلتا ہے نہ باطن، نہ کوئی روحانی لطف میسر ہوتا ہے اور نہ جسمانی سکون ملتا ہے۔

ہم آج سے ہی نماز کو اگر سکون سے رک کر، سمجھ کر، پڑھنے کی کوشش کرنے لگ جائیں تو اس طالب علم کا گمان نہیں یقین محکم ہے کہ ان شا اللہ ہماری نماز ہمیں اور ہمارے موجودہ حالات زندگی کے مسائل کے حل کا ایک مجرب نسخہ ثابت ہوگی۔

یہ نماز حقیقی معنوں میں ہمیں برائی و بے حیائی سے روک دے گی۔ ہمارے قلب کو خدائے واحد و برتر کے نور سے روشن کرنے کے ساتھ دل میں موجود تعصب، حسد، کینہ، شخصیت پسندی، خود پسندی، لالچ، بغض، انا، کے جذبات کو ختم کر کے دل کو ایسے پاک کر دے گی جیسے کوئی موبائل ڈیوائس فیکٹری ری سیٹ کے بعد سب کچھ ڈیلیٹ ہو جانے پر اپنی اس حالت میں واپس آ جاتی ہے جیسے اسے بنانے والے نے بنایا تھا۔

حافظ نعیم

فرعون کے گھر کی آسیہ

پیاری بہن محترمہ سارہ جوزف (Sarah Joseph) انگلینڈ کی ایک نامور صحافی ہیں اور مسلم یوتھ میگزین emel کی ایڈیٹر ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے انھیں نور ہدایت سے منور فرمایا ہے تب سے تو وہ برطانیہ سمیت پورے یورپ میں اس ہدایت کا نور پھیلانے میں مگن ہیں اور خود کو جدید فرعون کے گھر کی آسیہ کہتی ہیں۔ قبول اسلام کے بعد ان کے فکر انگیز تاثرات لندن کے مشہور جریدے امپیکٹ میں شائع ہوئے تھے۔

میں نے جب ان کے تاثرات پڑھے تو میں نہ صرف سوچنے پہ مجبور ہوا بلکہ بہت متاثر بھی ہوا۔ محترمہ کی ان قیمتی باتوں کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

یوں تو میں اسلام سے بحیثیت مجموعی بہت متاثر ہوں اور یہی تاثر مجھے اس کے زیر سایہ لے آیا ہے، لیکن ایک عورت کی حیثیت سے میں حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھن جیسی خواتین کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوں۔ اس طرح مدینہ کے مرد اور خواتین نے خدا کے دین کے فروغ اور استحکام کے لیے باہم مل کر جدو جہد کی۔ اور آج اس دور میں ہمیں بھی ایک بہتر، امن پسند معاشرے کے قیام کے لیے مل جل کر تگ ودو کرنی ہوگی، مردوں کو بھی اور خواتین کو بھی۔

میں ایسی برطانوی مسلمان خاتون کی حیثیت سے اپنے تاثرات قلم بند کر رہی ہوں جو اپنے خاندان، والدین کے حوالے سے اسلام سے متعارف نہیں ہوئی، بلکہ جس کا تعلق بالکل دوسری دنیا سے ہے۔ بلکہ موزوں تر الفاظ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا تعلق فرعون کے گھر سے ہے۔ جس طرح فرعون کے گھر میں ایک خدا شناس خاتون بھی تھی اور ایک بچہ بھی جو بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے نام سے خدا کے پیغام کا علم بردار بنا اور جادوگر بھی جنہوں نے فرعون کے عتاب اور

عذاب کا مقابلہ کیا، لیکن حق کو مسترد کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح آج یورپ کے ایوانوں میں میری طرح بے شمار لوگ ہیں، جو عہد حاضر میں جدید فرعونیت کا انکار کر رہے ہیں، سختیاں جھیل رہے ہیں، لیکن راہ حق پر مستقل مزاجی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہاں ان گنت افراد ایسے بھی ہیں، جن تک اگر حکمت اور سلیقے کے ساتھ اسلام کی دعوت پہنچائی جائے، تو وہ اسے قبول کرنے سے گریز نہیں کریں گے، لیکن افسوس کہ حق ان سے چھپایا گیا ہے اور یہ افسوس ناک حرکت یورپ کے میڈیا نے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں نے انجام دی ہے۔ کاش وہ اس کا احساس کریں۔

میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کروں گی کہ نسلی مسلمانوں نے اپنے طرز عمل، رہن سہن اور اپنے غصے والے مزاج کی وجہ سے اپنے اور غیر مسلم دنیا کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کردی ہے، جو دعوت وتبلیغ کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ غصہ نہ کیا جائے۔ غصہ ایک فطری امر ہے اور جب ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بزرگوں، بچوں اور نوجوانوں سے سنگدلانہ سلوک کیا جا رہا ہو، ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو اور تعصب وتنگ نظری کا رویہ جاری وساری ہو تو غصہ ضرور آئے گا۔ لیکن میں کہنا چاہوں گی کہ غصہ دعوت وتبلیغ دین کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ ہے اور چونکہ تبلیغ دین ہر مسلمان پر فرض عین ہے [یہ مصنفہ کی رائے ہے، ورنہ دین نے عام فرد پر بس اتنی ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اپنے قریبی حلقے میں حق کی تلقین کرے۔ ادارہ] اور قرآن میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے اور پیغمبر اسلام نے اس کی غیر معمولی تاکید فرمائی ہے اور کہا گیا ہے کہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت اور اچھے طریقے کے ساتھ، (النحل 16:125)۔ میرے نزدیک دعوت اور تبلیغ یورپ میں رہنے والے ہر مسلمان کے لیے گویا ایک سرحد ہے، جس کی حفاظت کرنا اس کے لیے لازم ہے۔ یہ ہمارا

بنیادی فریضہ ہے، جس سے ہرگز غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

چنانچہ میرے نزدیک جو لوگ اٹھتے بیٹھتے یورپ کو برا بھلا کہتے ہیں اور اسلام بمقابلہ مغرب کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ یورپ میں اسلام کی منزل کھوٹی کرتے ہیں۔ وہ بلا امتیاز سارے یورپ کو اسلام کا دشمن ثابت کرتے ہیں اور یہ نعرے اہل یورپ کے دلوں میں نفرت اور بے زاری پیدا کرتے ہیں۔ وہ بجا طور پر جواب دیتے ہیں کہ جب ہم سے برملا نفرت کی جاتی ہے تو ہم اسلام قبول کیوں کریں؟ ان لوگوں کا مذہب کیوں اختیار کریں، جو ہم سے بے زار اور متنفر ہیں؟

چنانچہ یقین کیجئے کہ اگر اسلام قبول کرنے سے پہلے میں نے متذکرہ نوعیت کے نعرے سنے ہوتے، اس طرح کی تحریروں سے متعارف ہوتی تو کبھی مسلمان نہ ہوتی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے نسلی مسلمانوں کے کردار کو نہیں دیکھا، بلکہ براہ راست قرآن وسنت کا مطالعہ کیا اور اسلام کے اعجاز نے مجھے اپنا اسیر بنالیا اور یہ محض میرا ہی احساس نہیں، مجھے بہت سے نومسلموں سے ملنے کا موقع ملا ہے اور ان سب کی یہی رائے ہے کہ ہم مسلمانوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسلام کو دیکھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ دردناک منظر پیغمبر اسلام کے کردار اور عمل سے کتنا مختلف ہے کہ ان گنت لوگ آپ کے پاکیزہ اور مثالی کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ آپ کے صبر، دیانت داری اور شدید ترین مخالفت میں بھی آپ کی انصاف پسندی اور متوازن رویہ مخالفین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اندازہ کیجیے کہ ایک مخالف بڑھیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھا دیا کرتی اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گزرتے تو ان پر کوڑا پھینک دیتی۔ لیکن آنحضرت اس سے الجھے بغیر خاموشی اور صبر سے آگے بڑھ جاتے۔ یہ بڑھیا کا روزانہ کا معمول تھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ ایک دو دن کے لئے اس معمول میں فرق آ گیا۔ بڑھیا گھر سے باہر نہ نکلی، تو حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے، تو حضور اس کے گھر تشریف لے گئے، اس کی عیادت فرمائی ادور غالباً کچھ مدد بھی کی۔ اس پر بڑھیا کا رویہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ اس کی نفرت محبت میں بدل گئی اور وہ مسلمان ہوگئی۔ (واضح رہے کہ یہ واقعہ مشہور تو ہے، لیکن سیرت واحادیث کی کتب میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے)۔

لیکن آہ! آج مسلمانوں کا اپنے پڑوسیوں اور عام ملنے والوں سے کیسا سلوک ہے؟ کوئی معمولی سے اختلاف کا اظہار کردے) تو ہم برگشتہ ہوکر اس سے تعلق توڑ لیتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہوئے کہ اپنا دفاع کرنا جارحیت نہیں ہے۔ دوسروں کی مخالفت کے جواب میں تیز تر مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا اسوہ گرامی ایسے حالات میں کیا تھا؟ یہ درست ہے کہ مدافعت جارحیت نہیں ہوتی، لیکن پھر صبر، تحمل اور حکمت وانتظار کس چیز کا نام ہے اور آخر مخالفین کو ہم کیسے اور کیوں کر اسلام کے قریب لائیں گے؟ حضور اقدس کی سیرت میں تو صبر، گہرا صبر، مسلسل صبر نمایاں ترین خوبی کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ عفوودرگزر آپ کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ لیکن ہم یہ خصوصیات کیوں ترک کر بیٹھے ہیں؟ ہم نے یہ ہتھیار کیوں کند کر دیا ہے؟

یاد رہے کہ ہم نے مغرب کو بحیثیت مجموعی اپنا دشمن قرار دے دیا ہے۔ یہ سراسر منفی رویہ ہے۔ ہماری نظر صرف خرابیوں پر ہے اور خوبیوں کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اسلام کل بنی نوع انسان کا اثاثہ ہے۔ اس پر کسی خاص قوم کا اجارہ نہیں اور ہمیں یہ اثاثہ دوسروں تک منتقل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی ہے اور یہ کوشش محبت، صبر، حکمت، محنت اور انتظار ہی سے انجام پذیر ہوگی۔ نعرے بازی، نفرت کی مہم اور مخالفانہ پروپیگنڈہ اس کے راستے میں خطرناک رکاوٹ بن جائے گی اور ہم اس نقصان کے لئے جواب دہ ہوں گے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمود مرزا

کچھ گزارشات شوہروں سے

قرآن مجید (۴:۳۴) کے مطابق خاندان کے ادارے کے سربراہ کی حیثیت شوہر کو دی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو شوہروں کے اوپر یہ ایک انتہائی کٹھن ذمہ داری ہے جس کے تحت ان کو موافق اور ناموافق حالات سے گزرتے ہوئے اپنے گھرانے کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام طور پر شوہر اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اور دیگر بدعنوان سربراہان کی طرح اپنے منصب کا غلط استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ بہت بری طرح متاثر ہوتا ہے اور لوگ پہلے مرحلے میں ہی شادی کے بندھن میں بندھنے سے گھبرانے لگ جاتے ہیں۔

تاہم چند تدابیر ایسی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر شوہر خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے میاں بیوی کے بندھن کے تقدس کو وقار اور محبت کے ساتھ قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ شوہروں کو چاہیے کہ وہ اپنے خاندانی معاملات کو جمہوریت کے اصول پر چلائیں نہ کہ آمریت کے اصول پر جہاں صرف انھی کی مرضی چلے گی اور کسی کو اپنی رائے دینے کا حق حاصل نہ ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آخری فیصلہ سربراہ کا ہی ہوتا ہے یا پھر جہاں کوئی جمود طاری ہو جائے تو وہاں انھی کو کوئی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن حتی الامکان ان کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہر بار اپنے استحقاق اور اختیار کو بالجبر نافذ کرنے کے بجائے استدلال اور قابلیت کو اہمیت دیتے ہوئے معاملات کو سرانجام دیں۔ میاں بیوی کو گھریلو مسائل باہمی گفتگو سے حل کرنا چاہییں اور معقولیت کی بنیاد پر اختلافات کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گفتگو اور تبادلہ خیال سے انسان کے رتبہ اور شعور میں ارتقاء کا عمل ہوتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ شوہروں کو اپنی اس بہت بڑی غلط فہمی کو دور کر لینا چاہیے کہ تمام گھریلو امور مثلاً کھانا پکانا گھر کی صفائی اور کپڑے دھونا وغیرہ سرتا سر بیویوں کی ذمہ داری ہے۔قرآن مجید میں کہیں ایسا نہیں لکھا کہ یہ صرف بیویوں کا کام ہے۔اگر قرآن یہ کہتا ہے کہ بیوی کے نان نفقے اور اخراجات کی ذمہ داری شوہر پر ہے تو اس کا خود بخود ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ گھر کے تمام کام کرنا بیوی پر ہی لازم ہے۔

جہاں تک ان تمام گھریلو امور کا تعلق ہے تو اس معاملے میں میاں اور بیوی دونوں کو چاہیے کہ باہمی رضامندی سے اور احترام کے ساتھ ان معاملات کو آپس میں طے کرلیں خاص طور پر جب دونوں ہی نوکری پیشہ ہوں۔دونوں کو چاہیے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ باہمی رضامندی سے تمام کاموں کو آپس میں تقسیم کرلیں جس میں یقیناً کوئی مضائقہ نہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ بیویوں کو گھر کا خرچہ دینے کے معاملے میں عام طور پر شوہر بخل اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ بیشتر مسلم ممالک کے جاگیردارانہ اور وڈیراشاہی نظام میں بیویاں اکثر اپنے شوہروں کے رحم وکرم پر ہی ہوتی ہیں جہاں ان کو بہت ہی معمولی جیب خرچ ملتا ہے اور بعض انتہائی صورتوں میں تو جیب خرچ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔شوہروں کی جانب سے یہ وہ بڑی کوتاہی ہے جو بلاتردد اور بلا جھجک جاری رہتی ہے۔اس سلسلے میں چند اہم نکات کو ملحوظ نظر رکھنا لازمی ہے۔

ا۔ بیوی کے جیب خرچ کو لازمی طور پر شوہر کی مالی حیثیت اور استطاعت کے مطابق ہونا چاہیے ورنہ کتنے افسوس کی بات ہوگی کہ شوہر کما تو لاکھوں میں رہا ہو لیکن بیوی کو محض چند ہزار ہی دے۔چنانچہ بیوی کا جیب خرچ دینے میں شوہر کو اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔

۲۔ بیوی کا جیب خرچ دیگر گھریلو اخراجات کے علاوہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ اس کی اپنی ذاتی

ضروریات کے لیے دیا جاتا ہے۔ عام طور پر شوہر یہ خیال کرتے ہیں کہ بیویوں کو گھر کے اخراجات کے لیے جو رقم دی جاتی ہے ان کو چاہیے کہ اسی میں سے ذاتی ضروریات کے لیے بھی کچھ بچالیں۔

۳۔ بیویوں کے جیب خرچ میں مہنگائی کو مدنظر رکھتے ہوئے متواتر اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ اکثر شوہر اپنی بیویوں کو جیب خرچ کے لیے وہی رقم دیتے ہیں جو آج سے دس بیس سال پہلے دیا کرتے تھے۔

۴۔ جیب خرچ کی رقم کو باقاعدگی سے ہر مہینے کے آغاز پر دے دینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جیب خرچ دیا تو جاتا ہے لیکن بہت تاخیر کے ساتھ اور بہت منت سماجت کرنے پر جس کے نتیجے میں بیوی کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بیوی شوہر کے اس رویہ سے اتنا شرمندہ ہوتی ہے کہ بالآخر جیب خرچ کا مطالبہ کرنا ہی چھوڑ دیتی ہے۔

۵۔ اگر بیوی کماتی ہو تب بھی شوہر کی جانب سے اس کے لیے جیب خرچ اس کا دینی حق ہے۔ یہ اس کا بڑا پن ہوگا اگر وہ اس کا مطالبہ نہ کرے یا اس میں کچھ کمی کر دے لیکن شوہر کو کسی صورت یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے یک طرفہ طور پر جیب خرچ بند کرنے فیصلہ کر دے۔

اگر شوہر ان اصولوں کی پیروی کریں گے تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کی بیویاں شکر گزاری کا مظاہرہ کریں گی لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو اور بیویوں کی شکایتیں اب بھی جاری رہیں تب بھی ان کو دل میں ذرا بھی تنگی محسوس کیے بغیر حسن سلوک کا معاملہ کرنا ہوگا۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ شوہروں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کی پرائیویسی کا احترام کرنا سیکھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی کچھ اپنی عادات واطوار اور رجحانات ہوتے ہیں جو کہ اس کی شخصیت کی انفرادی پہچان ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی تشکیل کے پیچھے بے شمار عوامل کارفرما

ہوتے ہیں جیسے پرورش، معاشرتی روایات، مزاج اور خاندانی پس منظر۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ تاہم شوہروں کو کسی صورت یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیویوں کو زبردستی اپنے سماجی اور مذہبی عقائد کو ماننے پر مجبور کریں یا پھر اپنی ترجیحات اور رجحانات کو اپنی بیویوں پر بالجبر نافذ کریں۔ جس طرح ان کو اپنی مرضی کے مطابق طرز زندگی کو اختیار کرنے کا حق ہے بالکل اسی طرح ان کی بیویوں کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ اور یہ حق ان کو کسی اور نے نہیں بلکہ کائنات کے پروردگار نے دیا ہے۔ تاہم اگر شوہر اپنی بیویوں کو یہ آزادی نہیں دیں گے تو وہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مجرم قرار پائیں گے۔

پانچویں چیز یہ ہے کہ شوہروں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ مخلص اور وفادار رہیں۔ شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد ان پر یہ لازم ہے کہ ان کے تمام تر رجحانات، توجہ اور دلچسپی کا مرکز کوئی اور نہیں بلکہ ان کی شریک حیات ہو۔ اس سے مراد محض اپنی جنسی خواہشات کو محدود کرنا نہیں بلکہ ان کے فکر وخیال کے ہر زاویے سے اخلاص کو نمایاں ہونا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ وہ دوسری خواتین کی ان خوبیوں سے متاثر ہونے کی کوشش نہ کریں جو ان کی بیویوں میں نہ ہوں اور نا ہی ان کمزوریوں کی بنا پر اپنی بیویوں سے شکوہ کریں۔ شوہر کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے نتیجے میں خاندان کے ادارے کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں گی۔ ایسا ادارہ جو معاشرہ کی اکائی ہے ایسا ادارہ جس کی مذہب میں سب سے بڑھ کر ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت ہے۔

شوہر کو یہ بات بھی لازمی طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ ہر فرد کے اندر کچھ خوبیاں اور کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ خوبیوں کو تسلیم کرنا چاہیے اور ہمیشہ سراہنا چاہیے جبکہ خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

محمد ذکوان ندوی

قرنطینہ ___ ایک یاددِہانی

عالمی میڈیا کے مطابق، اِس وقت دنیا کے بڑے حصے میں کورونا وائرس (Covid-19) کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اِس کے تحت ہم تاریخ کے عظیم قرنطینہ (quarantine) کے دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ وبا یقیناً خدا کے 'اِذن' (التغابن ۶۴:۱۱) کے تحت برپا ہوئی ہے۔ اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ خدا اِس کے ذریعے سے کیا چاہتا ہے؟ اِس اعتبار سے دیکھیے تو یہ وبا تمام بنی نوعِ انسان کے حق میں توبہ وتذکیر اور فطرت کی طرف واپسی کے لیے ایک جبری تنبیہ (التوبہ ۹:۱۲۶۔ الروم: ۳۰:۴۱) اور آزمایش (البقرہ ۲:۱۵۵-۱۵۶۔ العنکبوت ۲۹: ۲-۳) کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ صورتِ حال صبر واحتساب (introspection) اور توبہ ورُجوع الی اللہ کا تقاضا کرتی ہے، اور یہ رجوع الی اللہ ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے، انسانیت عموماً، نیز اہل کتاب اور امتِ مسلمہ خصوصاً، اپنے 'سمع وطاعت' کے 'عہد ومیثاق' (المائدہ ۵:۷) اور اپنی خصوصی حیثیت (الحج ۲۲:۷۸) کے باعث خدا کی 'نصرت' (الروم ۳۰:۴۷۔ محمد ۴۷:۷) حاصل کر سکتی ہے۔ خدا کی اِس نصرت کے بغیر دوسری اور کوئی تدبیر اُس کو ہرگز اِس آزمایش سے نکالنے والی نہیں۔

اِس لیے ضروری ہے کہ ہم سچی توبہ کرکے خدا کی طرف لوٹیں اور ماضی وحال کا بے رحمانہ جائزہ لے کر منصوبہ بند انداز میں اپنے مستقبل کا لائحۂ عمل تیار کریں۔ ماضی صرف گزرا ہوا لمحہ نہیں، وہ حال کی صورت میں زندہ رہنے والا ایک واقعہ ہے۔ اِسی طرح مستقبل کوئی بعید چیز نہیں، بلکہ وہ حال میں کیے جانے والے عمل کے ظہورِ نتائج ہی کا دوسرا نام ہے۔

صبر واحتساب

صبر کا مطلب پیش آمدہ حالات میں عجلت پسند اور بے برداشت نہ ہونا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ ترین اخلاقی صفت کا نام ہے۔ صبر ہی کی زمین پر تمام مطلوب اور نتیجہ خیز عمل انجام پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور قولِ رسول میں صبر و انتظار کو بہترین عبادت ('أفضل العبادة انتظار الفرج'، الجامع الصغیر: ۴۶۸۵۔) اور نصرت و معیتِ خداوندی (البقرہ ۲:۱۵۳) کی ایک یقینی ضمانت (إعلم أنّ النصر مع الصبر، مسند احمد: ۲۸۰۳۔) قرار دیا گیا ہے۔ صبر ہی کے ذریعے سے آدمی خدا کا قرب اور اُس کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔

احتساب کا مطلب بے لاگ جائزہ ہے۔ یہ گویا اپنے احوال میں کارفرما اسباب و عوامل (factors) کو دریافت کر کے اُن کا تدارک کرنا ہے۔ یہی حقیقت پسندی کسی زندہ فرد اور قوم کی علامت ہے۔ زندہ لوگ ایسے موقع پر احتساب کے ذریعے سے اپنے فکر و عمل کو بدلنے کا عزم کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس، زندگی سے محروم لوگ اپنے حصے کا عمل انجام دیے بغیر، صرف حالات کا ماتم کرتے اور اپنی قساوت و شیطانی تزئین (الانعام ۶:۴۳) کے نتیجے میں اُسے محض دوسرے عوامل کا نتیجہ ثابت کرنے میں اپنی توانائی کو مزید برباد کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ خارجی عامل صرف اُسی وقت فیصلہ کن حد تک موثر ہو سکتا ہے، جب کہ ہم خود اپنے عمل سے اُس کو موثر ہونے کا موقع فراہم کر دیں (الرعد ۱۳:۱۱)۔

ایمان و اخلاق کا بحران

ایک 'حاملِ کتاب' (فاطر ۳۵:۳۲) فرد اور گروہ کے اندر علم و ایمان اور اخلاقی اعتبار سے پائی جانے والی دوطرفہ غفلت ہی وہ 'اِذن' (سنّة اللّٰه) ہے، جو اُس کے خلاف دوسرے عوامل کو موثر ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے، یعنی 'حاملِ کتاب' گروہ کی خدا فراموشی اور دنیا پرستی، خدا کی طرف سے ملی ہوئی کتاب پر نہ ایمان و عمل کا حق ادا کرنا اور نہ اُس کے مطابق، دوسرے انسانوں

کو خدا کی اسکیم سے باخبر کرنا۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم وایمان کے راستے کو چھوڑ کر ہم پوری طرح غفلت و دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اللہ کی کتاب ہمارے درمیان ایک 'کتابِ مہجور' (الفرقان ۲۵:۳۰) بنی ہوئی ہے۔ قرآن اور کائنات پر غور وفکر، جو 'اِزدِیادِ ایمان' کا سرچشمہ تھا، وہ نہ صرف یہ کہ ہمارے درمیان باقی نہ رہا، بلکہ یہ نسخۂ کیمیا ہمارے مجموعی 'مذہبی' ڈھانچے میں عملاً صرف ایک اجنبی چیز بن کر رہ گیا۔ اخلاقی بحران اِس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ ابتدائی انسانیت اور بنیادی اخلاقی اوصاف تک اب قوم کے اکثر بڑوں کے درمیان بھی مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

اِسی اخلاقی بحران اور قساوت کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ پر آشوب ماحول میں بھی 'مذہبی' مقامات کی کثرت اور 'مذہب' کے نام پر رائج سرگرمیوں کی دھوم کے باوجود نہ ہمیں اپنے قرابت داروں سے مخلصانہ تعلق ہے، نہ پڑوسی کی خبر، اور نہ یہاں ایک زندہ معاشرے کی طرح قرآن کے مطلوب 'حضّ' (الحاقہ ۶۹: ۳۴۔ الفجر ۸۹: ۱۸۔ الماعون ۱۰۷:۳) اور ترغیب کے درجے میں ضرورت مند انسانوں کی حاجت براری ('طعامُ المسکین') کے لیے کوئی مطلوب سرگرمی اور حقیقی لائحۂ عمل پایا جاتا ہے قرنطینہ کا وقت ہمیں بتا رہا ہے کہ ہم علم و ایمان اور اخلاق و عمل، ہر اعتبار سے، اپنا جائزہ لے کر اپنے آپ کو اُس کے لیے تیار کریں، قبل اِس کے کہ اِس سے محروم کر کے ہمیں آخری طور پر ایمانی خیمہ (فُسطاطُ إیمان) کے بجائے نفاق کے خیمہ (فُسطاطُ نفاق) میں ڈال دیا جائے۔ (ابوداؤد: ۴۲۴۲)

اب آخری وقت آ گیا ہے کہ ہم 'علم و ایمان' (الروم ۳۰:۵۶) کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے قرآن مجید سے تذکیر و تدبر کا تعلق قائم کر کے اپنی تنہائیوں کو ذکر و دعا سے آباد کریں۔ خاص طور پر اب اُس دعا کا اہتمام کریں جس کے متعلق عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم اپنے اصحاب کونمازوں کے بعد اِس دعا کے اہتمام کی اِس قدرتاکید کرتے کہ آپ اُنھیں قرآن ہی کی طرح اِس دعا کے الفاظ اور معنویت کی تعلیم وتاکید فرماتے تھے۔(الموطا:۵۰۱۔)

یہی وجہ ہے کہ سابق اہل ایمان کے یہاں اِس دعا کا بہت زیادہ اہتمام پایا جاتا تھا۔ چنانچہ مشہور تابعی طاوس بن کیسان (وفات:۱۰۶ ہجری) اِس دعا کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، (فتح الباری:۲/۴۱۱،رقم:۸۳۳) اورارشادِرسول کی خلاف ورزی کی بنا پر اپنے بیٹے عبداللہ کوتلقین فرماتے کہ اِس دعا کے بغیر جونماز ادا کی جائے،اُسے دہراؤ(صحیح مسلم:۵۹۰،شرح النووی:۵/ ۸۹۔)اِس دعا کے الفاظ یہ ہیں:'اللّٰهم إني أعوذُبك من عذابِ جهنم، وأعوذُبك من عذابِ القبر، وأعوذُ بك مِن فتنةِ المسيحِ الدّجّال، وأعوذُ بك مِن فتنةِ المَحْيا والمَمَات' (خدایا، میں تجھ سے جہنم کے عذاب،قبر کے عذاب،مسیحِ دجال کے فتنے اور زندگی اور موت کی آزمایش سے پناہ مانگتا ہوں،الموطا:۵۰۱)۔

موجودہ لاک ڈاؤن (lockdown) اُس اخروی لاک ڈاؤن کی یاد دِلا رہا ہے، جب کہ خدا اِس عالم کی بساط لپیٹ کر ایک نئی دنیا بنائے گا، جہاں صرف اُس کے سچے بندے اُس کی نعمتوں میں حصہ پائیں اور جھوٹے لوگوں کے لیے یہ مقدر کردیا جائے کہ وہ ابدی طور پر اِس ''کائناتی لاک ڈاؤن'' کے درمیان حسرت اور محرومی کی زندگی گزارتے رہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی کے عیوب کی جستجو کرو اور نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ غیبت کرو اور نہ بغض رکھو اور اللہ کے بندے بھائی بن کر رہو۔(صحیح بخاری: جلدسوم: حدیث نمبر 1002)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (70)

اخلاقی طور پر مطلوب وغیر مطلوب رویے: عہد وامانت

قرآن مجید میں بیان کردہ اخلاقی مطالبات کے حوالے سے جن جامع اصطلاحات کا ہم مطالعہ کررہے ہیں ان میں ایک آخری اہم اصطلاح عہد وامانت کی ہے۔ یہ دونوں ہی ان ذمہ داریوں کا جامع بیان ہیں جو خالق وخلق کے حوالے سے انسانوں پر عائد ہوتی ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ عہد عام طور پر ان ذمہ داریوں کو بیان کرتا ہے جو ہم آگے بڑھ کر قبول کرتے ہیں جبکہ امانت کا لفظ ان ذمہ داریوں کا بیان ہوتا ہے جو کسی منصب، معاملے، صلاحیت یا اعتماد کی بنیاد پر دوسرے ہم پر ڈال دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ بھی بیان کیا ہے اور الگ الگ بھی۔ ذیل میں عہد وامانت کے وہ پہلو تفصیل کے ساتھ بیان کررہے ہیں جو قرآن مجید کے بیانات کی روشنی میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

عہد ومیثاق

قرآن مجید میں عہد اور میثاق کے الفاظ ایک ہی حقیقت کے بیان کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ تاہم میثاق کے الفاظ میں عہد سے زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے اور یہ اس پیمان کا بیان ہے جسے پختہ کرکے باندھا جاتا ہے۔ عہد ومیثاق کو قرآن مجید نے دو پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ ایک پہلو وہ ہے جس میں اسے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کئی مفاہیم مراد ہوتے ہیں۔ اس سے مراد بندگی کا وہ عہد بھی ہے جسے باندھ کر ہم انسان اس دنیا میں آئے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے۔ اس کو عام طور پر عہد الست کہا جاتا ہے۔ اس عہد کا مفہوم اس ذمہ داری کو اٹھانا ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور شیطان کی اس دعوت کی

پیروی نہیں کریں گے جس میں ہمیں وہ اللہ کی عبادت سے ہٹا کر غیر اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔

اس کا ایک اور مفہوم اس دنیا میں آنے کے بعد پورے شعور کے ساتھ اللہ کے ساتھ باندھا گیا کوئی عہد و میثاق ہے۔ انبیا کی امتیں اللہ تعالیٰ سے شریعت کی پاسداری اور ان کے نبیوں کی نصرت کا عہد اسی پس منظر میں کرتی ہیں۔ ہر شخص جو پورے شعور سے اسلام قبول کرتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے یہی عہد کرتا ہے کہ وہ شریعت کے احکام کی پیروی کرے گا۔ اس کا ایک تیسرا اور آخری مفہوم وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر انسان خود اپنے آپ سے یا دوسرے انسانوں سے باندھا کرتا ہے۔ نذر ماننا اور قسم کھانا اسی عہد کی اقسام ہیں۔

عہد کا دوسرا پہلو وہ عمومی قسم کا وعدہ ہے جو انسان کسی دوسرے انسانوں سے کرتا ہے۔ یہ عہد زبانی بھی ہوسکتا ہے، کسی تحریری معاہدے کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور کسی قانونی دستاویز پر دستخط کر کے بھی ہوسکتا ہے۔ یہ وعدے کے الفاظ کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اور وعدہ کے الفاظ کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ عہد چاہے پہلی قسم کا ہو جس میں خدا کا نام لیا گیا ہو یا پھر دوسری قسم کا جس میں خدا نام نہ لیا گیا ہو، ہر صورت میں مقدس اور قابل احترام ہے۔ اس کا پورا کرنا ایک بنیادی اخلاقی وصف ہے جس کے بغیر کوئی انسان اعلیٰ انسان نہیں کہلا سکتا اور کوئی مومن خدا کی نگاہوں میں سرخرو نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جسے قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصیت قرار دیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کریں گے۔ انسانوں کو بھی انھوں نے متنبہ کیا ہے کہ انھیں اپنے عہد و میثاق کی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر عہد کی پرسش کریں گے۔ اس دنیا میں امتوں کا بدترین وصف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتی ہیں اور اعلیٰ ترین انسان اپنا عہد نبھاتے ہیں۔ اہل ایمان کو اسی پس منظر میں ہر طرح کے حالات میں عہد کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے۔

امانت

امانت کا عام طور پر مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے پاس اپنی کوئی شے یا پیسے اس پر اعتماد کرتے ہوئے یا اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے اس یقین کے ساتھ رکھوا دے کہ تقاضا کرنے پر اس کی ملکیت اسے واپس کر دی جائے گی۔ امانت کے مفہوم میں یہ چیز بے شک شامل ہے اور قرآن مجید نے اس مفہوم میں اسے استعمال بھی کیا ہے۔ مگر امانت کا دائرہ دراصل اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا کہ اس کا حقیقی مفہوم کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنا ہے۔ یہ مفہوم امانت کے اس مروجہ تصور میں بھی پوری طرح شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی ملکیت کی کوئی شے بھی کسی کے پاس رکھوانا امانت اسی لیے کہلاتا ہے کہ ایک فرد دوسرے پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ اس کی شے کو محفوظ رکھے اور اس کے مطالبے پر اسے واپس کر دے گا۔ ظاہر ہے یہ ایک ذمہ داری ہے جو اس دوسرے فرد پر عاید کر دی گئی ہے۔

تاہم امانت کو قرآن مجید نے بہت وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ سورہ نساء آیت 58 میں ان مناصب اور ذمہ داریوں کو امانت قرار دیا گیا ہے جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ میرٹ کی پابندی کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو ان افراد کو دیں جو ان کے اہل ہیں۔ اسی طرح سورہ انفال آیت 27 میں امانت ان ذمہ داریوں کو بیان کرتی ہے جو اللہ اور اس کی رسول پر ایمان لانے کے بعد شریعت کی پاسداری اور نصرت دین کے پہلو سے اہل ایمان پر عاید ہو جاتی ہیں۔ سورہ احزاب آیت 72 میں امانت سے مراد وہ اختیار ہے جو اس کائنات میں صرف خدا کو حاصل ہے اور جسے جب آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا گیا تو انھوں نے اس اختیار کے ساتھ منسلک ذمہ داریوں کے بوجھ سے ڈر کر اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور انسان نے آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیا۔

قرآن مجید میں لفظ امانت کے ان استعمالات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ان تمام ذمہ داریوں کا بیان ہے جو دین و دنیا کے پہلو سے انسانوں پر عاید ہوتی ہیں۔ امانت ان تمام حقوق کا بیان ہے جو خدا اور بندوں کے حوالے سے قانونی، شرعی اور اخلاقی طور پر ہم پر عاید ہوتے ہیں۔ یہ بھی

واضح رہے کہ ضروری نہیں کہ امانت کی ذمہ داری کا بوجھ ہم نے کسی باقاعدہ معاملے کے بعد اٹھایا ہو بلکہ فطرت انسانی، خاندانی، سماجی اور ریاستی سطح پر ہماری مختلف حیثیتوں کی بنا پر جو ذمہ داریاں خود بخود ہم عائد ہوجاتی ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ جیسے ریاستی معاملات میں قانون کی پابندی، خاندان میں مختلف رشتوں کا تقدس اور ادائیگی حقوق وغیرہ سب اس کا حصہ ہیں۔

امانت اور اسی طرح عہد کا یہ جامع مفہوم اگر واضح ہے تو پھر یہ بات سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ قرآن مجید جب اہل جنت کے اوصاف بیان کرتا ہے تو کیوں عہد و امانت کی پاسداری کو ایک لازمی وصف کے طور پر بیان کرتا ہے۔

قرآنی بیانات

''(اطاعت کا یہ تقاضا اُس ارادہ و اختیار کی بنا پر کیا جاتا ہے جو ہم نے انسان کو عطا فرمایا ہے)۔ ہم نے یہ امانت زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی تو اُنھوں نے اُس کو اٹھانے سے انکار کردیا تھا اور اُس سے ڈر گئے تھے، مگر انسان نے اُس کو اٹھالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی ظالم اور جذبات سے مغلوب ہوجانے والا ہے۔''، (الاحزاب 72:33)

''ایمان والو، اللہ و رسول سے بے وفائی نہ کرو، (یہ امانت میں خیانت ہے) اور جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ کرو۔''، (الانفال 27:8)

''(ایمان والو، اللہ نے تمھیں ایک عظیم بادشاہی عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اِس موقع پر) اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ نہایت اچھی بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ بے شک، اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''، (النساء 58:4)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔''، (المومنون 8:23)

''جو (خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں) اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں،''، (المعارج 32:70)

''البتہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے بالا خانے اور بالا خانوں کے اوپر بھی آراستہ بالا خانے ہیں۔ اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے۔ اللہ اپنے

وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔''،(الزمر 20:39)

''سوا اپنے اِس عہد کو توڑ دینے ہی کی وجہ سے ہم نے اِن پر لعنت کی اور اِن کے دل سخت کر دیے۔(اب اِن کی حالت یہ ہے کہ) یہ کلام کو اُس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں اور جس چیز کے ذریعے سے اِنھیں یاد دہانی کی گئی تھی، اُس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے ہیں اور (یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ) آئے دن تم اِن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتے ہو۔ اِن میں سے بہت تھوڑے ہیں جو اِن چیزوں سے بچے ہوئے ہیں۔(اِن سے اب تم کسی خیر کی توقع نہیں کر سکتے)، سو معاف کرو، (اے پیغمبر)، اور اِن سے درگذر کرتے رہو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔''،(المائدہ 13:5)

''اِسی طرح ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ پھر جس چیز کے ذریعے سے اُنھیں یاد دہانی کی گئی، اُس کا ایک حصہ وہ بھی بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے اِن دونوں کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑکا دی۔ (اب اُسی میں جل رہے ہیں) اور اللہ عنقریب اِنھیں بتا دے گا جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں۔''،(المائدہ 14:5)

''اور اُن لوگوں کو جنھیں کتاب دی گئی، اُن کا وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے اُن سے لیا تھا کہ تم لوگوں کے سامنے اِس کتاب کو لازماً بیان کرو گے اور اِسے ہرگز نہ چھپاؤ گے۔ پھر اُنھوں نے اِسے پس پشت ڈال دیا اور اِس کے بدلے میں بہت تھوڑی قیمت لے لی۔ سو کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے یہ خرید لائے ہیں۔''،(آل عمران 187:3)

''اِس سے وہ لوگ، البتہ مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملے ہوں جن سے تمھارا کوئی معاہدہ ہے۔ اِسی طرح وہ لوگ بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس اِس طرح آئیں کہ نہ اپنے اندر تم سے لڑنے کی ہمت پاتے ہوں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو اُنھیں تم پر دلیر کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے الگ رہیں اور جنگ نہ کریں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ تمھیں بھی اُن کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔''،(النساء 90:4)

''(ایمان والو، اِس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان حمایت و نصرت کا خواہاں ہو تو اُس سے کہو کہ مدینہ آجائے۔ اِس لیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور

(اُن کی) مدد کی ہے، وہی ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر ہجرت کر کے (مدینہ) نہیں آئے، تمھارا اُن سے حمایت و نصرت کا کوئی رشتہ نہیں ہوسکتا، جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں، اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔ (یاد رکھو)، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''، (الانفال 72:8)

''جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں، اور اِس طرح زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو (دنیا اور آخرت، دونوں میں) نامراد ہیں۔''، (البقرہ 2:27)

''(اِس رعایت سے فائدہ اٹھاؤ) اور اپنے اوپر اللہ کی اِس نعمت کو یاد رکھو اور اُس کے اُس عہد و میثاق کو بھی جو اُس نے تم سے ٹھیرایا تھا، جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم فرماں بردار ہیں، (اِسے یاد رکھو) اور اللہ سے ڈرو، اِس لیے کہ اللہ دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔''، (المائدہ 7:5)

''ایمان والو، (اپنے پروردگار سے باندھے ہوئے سب) عہد و پیمان پورے کرو۔ تمھارے لیے مویشی کی قسم کے تمام چوپایے حلال ٹھیرائے گئے ہیں، سوائے اُن کے جو تمھیں بتائے جا رہے ہیں۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو حلال نہ کر لو۔ (یہ اللہ کا حکم ہے اور) اللہ جو چاہتا ہے، حکم دیتا ہے۔''، (المائدہ 1:5)

''(اب تمھاری دنیا الگ اور اِن کی دنیا الگ ہے)۔ آدم کے بیٹو، کیا میں نے تمھیں پابند نہیں کر دیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، اِس لیے کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔''، (یٰس 60:36)

''اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے سے جو (اُس کے لیے) بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب بات کہو تو حق کی بات کہو، اگرچہ معاملہ اپنے کسی رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اللہ نے تمھیں ہدایت کی ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔''، (انعام 6:152)

''تم بھی، (اے اہل کتاب)، اللہ کے ساتھ (اپنے) عہد کو پورا کرو، جب کہ تم اُسے باندھ

چکے ہو اور اپنی قسمیں اُن کے پختہ کر لینے کے بعد مت توڑو، جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھیرا چکے ہو۔ بے شک، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔''، (النحل 16:91)

''جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اِس پیمان کو توڑتے نہیں۔''، (الرعد 13:20)

''یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اُس دن سے ڈرتے رہے جس کا ہول ہر چیز کو گھیر لے گا۔''، (الدھر 76:7)

''اِن میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اُس نے ہم کو اپنے فضل سے نوازا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہوں گے۔''، (التوبہ 9:75)

''اور اگر تم سفر میں ہو اور تمھیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسے کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس (رہن کی وہ چیز) امانت رکھی گئی ہے، وہ یہ امانت واپس کر دے اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے (اور اِس معاملے پر گواہی کرا لے)، اور گواہی (جس صورت میں بھی ہو، اُس) کو ہرگز نہ چھپاؤ اور (یاد رکھو کہ) جو اُسے چھپائے گا، اُس کا دل گناہ گار ہو گا، اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔''، (البقرہ 2:283)

''ایمان والوں میں وہ مردان حق بھی ہیں کہ اُنھوں نے اللہ سے جس چیز پر عہد کیا تھا، اُسے پورا کر دکھایا ہے۔ پھر اُن میں سے کوئی اپنا ذمہ پورا کر چکا اور کوئی منتظر ہے۔ اُنھوں نے اِس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔''، (الاحزاب 33:23)

''اور یاد کرو، جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین کے ساتھ اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔ اور عہد لیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے) پھر گئے اور حقیقت یہ ہے کہ تم پھر جانے والے لوگ ہی ہو۔''، (البقرہ 2:83)

''تم یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو۔ ہاں، مگر اچھے طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو، اِس لیے کہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''، (بنی اسرائیل 17:34)

ڈاکٹر محمد عامر گزدر

اسلامی شریعت میں رفع حرج اور آسانی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو جو شریعت انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے دی گئی ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ کبھی ایسا کوئی حکم نہیں دیتے جو انسان کے تحمل سے باہر اور اُس کی برداشت اور استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ ایمان اور عمل صالح کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ڈالتا ہے، وہ اُسی حد تک ہے، جس حد تک اُن کے امکان میں ہے۔ یہ ذمہ داری اُن کی حد وسع سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ شریعت خداوندی کے تمام احکام میں یہ معیار ہمیشہ سے قائم ہے کہ لوگوں کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ اُن پر نہ ڈالا جائے اور جو حکم بھی دیا جائے، انسان کی فطرت اور اُس کی صلاحیتوں کے مطابق دیا جائے۔

اِس باب میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنت سورہ بقرۃ میں اِس طرح بیان ہوئی ہے کہ: (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا (البقرۃ 286)۔

سورہ انعام، اعراف اور المومنون میں اپنا یہی ضابطہ اللہ تعالیٰ نے اِس اسلوب میں بیان فرمایا ہے کہ (لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) ہم کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔

قرآن مجید سے پوری صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے احکام و مطالبات کی انجام دہی میں مسلمانوں کے لیے کسی قسم کی کوئی تنگی اور مشقت نہیں رکھی ہے۔ بلکہ اِس کے برعکس ہم یہ جانتے ہیں کہ شریعت کے احکام و آداب اور دینی شعائر کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے رعایت اور رخصت دینے، آسانی پیدا کرنے اور تنگی کو اُٹھا دینے کا قاعدہ اپنایا ہے۔ سورہ حج میں ایک مقام پر خدا کی بندگی کے بنیادی تقاضوں کو

بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے اپنی شریعت میں رفع حرج کا یہ اصول اِس طرح بیان فرمایا ہے(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ)۔ اور(جو)شریعت (تمھیں عطا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُس) میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔تمھارے باپ ابراہیم کی ملت تمھارے لیے پسند فرمائی ہے(الحج78:22) ۔

اسلامی شریعت نے رفع حرج کا اِس قدر لحاظ رکھا ہے کہ سورہ نساء کی آیت 28 میں اللہ تعالیٰ نے اُن پابندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو علما کی فقہی موشگافیوں کے باعث لوگوں پر لگ چکی تھیں،ارشادفرمایاہے کہ(يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا)۔اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے،(اِس لیے کہ تمھاری کمزوریوں کی رعایت کرے)اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

اِسی طرح رمضان کے روزوں سے متعلق ایک رخصت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور اصول فرمایا ہے کہ(يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ)۔ (یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ)اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے(البقرۃ:185)۔

وضواور غسل کے حوالے سے ایک رعایت دینے کے متصل بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ(مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ)۔اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا(المائدۃ:6) ۔

شریعت اسلامی میں رفع حرج اور رعایت دینے کا یہ مقدمہ جس صراحت کے ساتھ قرآن مجید مین بیان ہوا ہے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی تعلیمات میں بھی اِسی قرآنی ضابطے کے شواہد جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔آپ کے علم وعمل کی روایتوں میں دین میں آسانی اور رخصت دینے اور مشقت اور تنگی کی نفی پر مبنی جو اصولی رہنمائی ہمیں ملتی ہے، وہ درج

ذیل احادیث میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوگئی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ :قِيلَ لِرَسُولِ اللَّهِ أَيُّ الْأَدْيَانِ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ؟ قَالَ :الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ دین کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: جو سب سے یکسو ہو کر صرف اللہ کے لیے ہو اور جس میں سہولت ہو (مسند احمد، رقم 2107)۔

یہ اسلام کی تعریف ہے، جس طرح کہ خدا کے پیغمبروں نے اُسے پیش کیا ہے۔ چنانچہ قرآن سے اُس کی جو صورت سامنے آتی ہے، اُس میں زمین و آسمان کے پروردگار کے لیے وہی یک سوئی اور عمل کے لحاظ سے وہی سہولت ہے جس کا ذکر اِس روایت میں ہوا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ایک دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:
إِنَّ دِينَ اللَّهِ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ ۔اللہ کا دین وہ ہے جس میں صرف اللہ کے لیے یک سوئی ہوتی ہے اور جس میں سہولت اور آسانی ہے (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 794)۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَيَسِّرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ، وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِس میں شبہ نہیں کہ دین آسان ہے، اِس میں شدت اختیار کر کے جو شخص بھی اِسے پچھاڑنے کی کوشش کرے گا، یہ اُس کو عاجز کر دے گا۔ سو راہ راست کی رہنمائی کرو اور میانہ روی اختیار کرو اور لوگوں کو بشارت دو اور اُن کے لیے آسانی پیدا کرو اور صبح و شام اور رات کے کچھ حصے میں اللہ سے مدد مانگتے رہو (السنن الصغری، نسائی، رقم 5034)۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ :يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، وَسَكِّنُوا وَلَا تُنَفِّرُوا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، اُنھیں مشکل میں نہ ڈالو اور اُنھیں اطمینان دلاؤ، اُن کو بھگاؤ نہیں (مسند طیالسی، رقم 2199)۔

مطلب یہ ہے کہ اُن کے سامنے دین کو اِس طرح مشکل بنا کر پیش نہ کرو کہ وہ اُس سے گریز وفرار کے راستے تلاش کرنے لگیں۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ ایک ہی چیز بعض اعتبار سے سہل اور بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ دعوت کی ابتدا میں اگر اُس کے وہی پہلو نمایاں کیے جائیں جو بیگانے سے بیگانے لوگوں کے لیے بھی اپنے اندر دل آویزی کا بہت کچھ سامان رکھتے ہیں تو بعد میں توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے طبائع سے بظاہر ناموافق چیزوں کو بھی بتدریج قبول کر لیں گے۔

عَنْ أَبِی مُوسَی الْأَشْعَرِیِّ، قَالَ :كَانَ رَسُولُ اللَّهِ إِذَا بَعَثَ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِهِ فِی بَعْضِ أَمْرِهِ قَالَ :بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے صحابہ میں سے کسی کو اپنے کسی کام کے حوالے سے کہیں بھیجتے تو فرماتے تھے: تم لوگوں کو خوش خبری دو، اُنھیں بھگاؤ نہیں اور اُن کے لیے آسانی پیدا کرو، اُنھیں مشکل میں نہ ڈالو (صحیح مسلم، رقم 1732)۔

عَنْ أَبِی مُوسَی الْأَشْعَرِیِّ، أَنَّ النَّبِی بَعَثَهُ وَمُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ، فَقَالَ (لَهُمَا) : (انْطَلِقَا فَادْعُوَا النَّاسَ إِلَى الْإِسْلَامِ) يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو دونوں سے کہا: تم لوگ جاؤ اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دو اور (یاد رکھو، اپنی اِس دعوت میں) اُن کے لیے آسانی پیدا کرنا، اُنھیں مشکل میں نہ ڈالنا اور اُنھیں بشارت دینا، اُن کو بھگانا نہیں اور ایک دوسرے کی بات ماننا، آپس میں اختلاف نہ کرنا (صحیح مسلم،

رقم 1733۔ مسند احمد، رقم 19742۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم 6561)۔

اِس سے مراد وہ اختلاف ہے جو ضدم ضدا کی صورت اختیار کرلے اور جس کے نتیجے میں لوگ اجتماعی معاملات کو بھی حق و باطل کا مسئلہ بنا کر کسی نظم کے تحت کام کرنے سے انکار کر دیں۔ اِس طرح کی صورت حال پیدا ہوجائے تو تجربہ یہی ہے کہ تمام کوششیں پھر ایک دوسرے کی نفی ہی میں صرف ہونے لگتی ہیں اور لوگ جس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے تھے، وہ بالکل پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ، وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ

تم آسانی پیدا کرنے کے لیے اُٹھائے گئے ہو، لوگوں کو مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں اُٹھائے گئے۔ (مسند حمیدی، رقم 967)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے اپنے صحابہ سے فرمایا:

عَلِّمُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا

لوگوں کو سکھاؤ اور اُن کے لیے آسانی پیدا کرو، اُنھیں مشکل میں نہ ڈالو (مسند شافعی، رقم 22)۔

عَنْ مِحْجَنِ بْنِ الْأَدْرَعِ، قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (إِنَّ)خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ قَالَهَا ثَلَاثًا۔

مِحجن بن اَدرَع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمھارا بہترین دین وہی ہے جو آسان تر ہو۔ آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی (مسند طیالسی، رقم 1392۔ مسند احمد، رقم 20349)۔

دین سے مراد یہاں دینی رویہ ہے جو کوئی شخص دین کو سمجھ کر اُس پر عمل کے لیے اختیار کرتا ہے۔

وَعَنْهُ فِي رِوَايَةٍ قَالَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى رَضِيَ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ الْيُسْرَ، وَكَرِهَ لَهَا الْعُسْرَ قَالَهَا ثَلَاثًا

اِنھی مِجْحَن بن اَدرَع سے مروی ہے کہ آپ نے اِس موقع پر فرمایا: اللہ نے اِس اُمت کے لیے آسانی کو پسند فرمایا اور مشکل کو ناپسند کیا ہے۔ آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم 707)۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر سیدہ عائشہ سے فرمایا

إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّفًا، وَلَكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا ...

اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا بنا کر مبعوث نہیں فرمایا ہے، بلکہ مجھے سکھانے والا اور آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے (مسند احمد، رقم 14515)۔ اِسی روایت کے ایک طریق میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ

إِنَّ اللهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّتًا، وَلَا مُتَعَنِّتًا، وَلَكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا اور لوگوں کے لیے مشکلات ڈھونڈنے والا بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ اللہ نے مجھے تعلیم دینے والا اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے (صحیح مسلم، رقم 1478)۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ:

مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ بَيْنَ أَمْرَيْنِ، أَحَدُهُمَا أَيْسَرُ مِنَ الْآخَرِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا ...

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی ایسے دو کاموں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا جن میں سے ایک دوسرے کی نسبت آسان ہوتا تو آپ اُن میں سے آسان تر کا انتخاب فرماتے، جب کہ تک اُس میں گناہ کی کوئی بات نہ ہو (مسند احمد، رقم 25288)۔

احکامِ شریعت میں تیسر اور رفع حرج کے اِس اصول پر قائم رخصت اور تخفیف کے بہت سے احکام ہیں جو قرآن وسنت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل کی روایتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ذیل میں ہم اُن احکام کی چند مثالیں پیش کریں گے، جن میں اللہ اور اُس کے رسول نے آسانی اور انسانی حالات کی رعایت کے مذکورہ بالا اصول کو اسلامی شریعت کے بہت سے احکام میں منطبق کر کے واضح فرما دیا ہے۔

رمضان کے روزوں میں رخصت

سورہ بقرہ میں رمضان کے پورے مہینے کے روزوں کی بیانِ فرضیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اِس حکم کے ضمن میں ایک آسانی اور رخصت بیان فرمائی ہے کہ سفر یا بیماری (یعنی کسی مشقت) کی وجہ سے آدمی کے لیے روزہ رکھنا تکلیف کا باعث بن جائے تو ایسی صورت میں وہ رمضان کا فرض روزہ بھی چھوڑ سکتا ہے، اِس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ تاہم چھوٹے ہوئے روزوں کو بعد میں رکھ کر اُسے اِس مہینے کے روزوں کی گنتی پوری کرنا ہوگی۔

ارشاد فرمایا ہے:

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِی أُنزِلَ فِيهِ الۡقُرۡآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الۡهُدَى وَالۡفُرۡقَان فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ وَمَنۡ كَانَ مَرِيضًا أَوۡ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنۡ أَيَّامٍ ...الآية

رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے سراسر ہدایت بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) رہنمائی بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُسے چاہیے کہ اِس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ (البقرۃ: 185)۔

پھر اِس رخصت کو بیان کرنے کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں موجود تیسر کا ضابطہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ

(یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ

تمھارے ساتھ سختی کرے(البقرۃ:185)۔

یہ تیسر اور رفع حرج کے اصول کی رعایت سے شریعت کی ایک فرض عبادت کی ادائیگی کو ایک عام مشقت کی وجہ سے موخر کر دینے کی صریح مثال ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دین کے احکام کی بجا آوری میں مسلمانوں کے لیے کوئی سختی نہیں رکھی گئی ہے۔

بیماروں اور معذوروں کے لیے جہاد سے رخصت

مشقت اور عذر کی بنا پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دین کے لازمی مطالبات سے بھی بالکل مستثنیٰ فرما دیتے ہیں۔ اِس کی ایک مثال قرآنی شریعت میں رسول اللہ کی معیت میں قتال فی سبیل اللہ کے باب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض موقعوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معیت میں جہاد کے لیے مسلمانوں سے اپنے جان و مال پیش کرنے کا مطالبہ رکھا تو اُن موقعوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی رفع حرج کا اپنا ضابطہ بیان فرما کر حقیقی معذورین کے لیے آسانی پیدا فرمائی اور اُن کو اِس لازمی مطالبے سے رخصت دے کر واضح فرما دیا کہ ایسے کمزور، مریض اور تنگ حال مسلمان جو جہاد کے لیے تو بے قرار ہیں، لیکن اِس راہ میں خرچ کرنے کے لیے اُن کے پاس کچھ ہے، نہ وہ زادراہ اور اپنی سواری کا بندوبست کرنے پر قادر ہیں۔ ایسے معذور مسلمان جہاد میں شامل نہ ہو سکیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ یہ اللہ کے دین اور اُس کے رسول کے خیر خواہ رہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

لَيۡسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الۡمَرۡضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنۡفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى الۡمُحۡسِنِينَ مِنۡ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوۡكَ لِتَحۡمِلَهُمۡ قُلۡتَ لَا أَجِدُ مَا أَحۡمِلُكُمۡ عَلَيۡهِ تَوَلَّوا وَّأَعۡيُنُهُمۡ تَفِيضُ مِنَ الدَّمۡعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنۡفِقُونَ

اُن لوگوں پر، البتہ کوئی گناہ نہیں جو کمزور ہیں اور اُن پر جو بیمار ہیں اور اُن پر بھی جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے، جب کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں۔ ایسے نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اِسی طرح اُن پر بھی کوئی الزام نہیں ہے کہ جب تمھارے پاس آتے ہیں کہ اُن کے لیے سواری کا بندوبست کر دو، تم کہتے ہو کہ میں تمھارے لیے سواری کا بندوبست نہیں کر سکتا تو اِس طرح لوٹتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں سے اِس غم میں آنسو بہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے خرچ پر جانے کی مقدرت نہیں رکھتے (التوبۃ: 91)۔

جہاد کے باب میں معذورین کے لیے اِسی طرح کی رخصت اور رفع حرج کو سورہ فتح میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا

اِس جہاد سے صرف معذورین مستثنیٰ ہوں گے، اِس لیے کہ) اندھے پر کوئی گناہ نہیں، (اگر وہ جہاد کے لیے نہ نکلے۔ اِسی طرح) لنگڑے پر بھی گناہ نہیں اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے، (اگر وہ اطاعت پر قائم ہوں)۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہے گا، اللہ اُس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جو روگردانی کرے گا، اُسے وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا (الفتح: 17)۔

اِس حکم میں دیکھ لیجیے کہ معذور اور بیمار لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کے ایک لازمی مطالبے سے مستثنیٰ قرار دے کر بالکلیہ رخصت عنایت فرما دی ہے۔

[جاری ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (72)

مغربی سیاحوں کے لئے ان اشیاء میں بہت کشش تھی۔ انہوں نے اپنے ملکوں میں جا کر اپنے دوستوں کو مشرقی بادشاہوں کے لگژری لائف اسٹائل کی داستانیں سنانا ہوں گی۔ اس کے برعکس میرے لئے یہاں سلطنت عثمانیہ کے زوال کی داستان اکٹھی کردی گئی تھی۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے۔۔۔۔۔۔ شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

عثمانی سلاطین بھی اپنی ابتدا میں بڑے جفاکش اور محنتی لوگ تھے۔ جب انہوں نے محنت چھوڑ کر عیاشی کی زندگی اختیار کی تو ان پر زوال آ گیا۔ اسی زوال کی داستان یہاں اس عجائب گھر میں محفوظ کردی گئی تھی۔

ایک کمرے سے نکل کر ہم آگے بڑھے تو ایک بالکنی ہمارے سامنے تھی جس سے گولڈن ہارن کا نظارہ نہایت ہی دلفریب نظر آ رہا تھا۔ اس معاملے میں سلاطین واقعی بہت ہی باذوق واقع ہوئے تھے۔ بالکنی کے نیچے ایک ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا جس میں ہر چیز پانچ گنا قیمت پر فروخت کی جا رہی تھی۔

مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے ہم نے بادشاہوں کے دیوان عام اور خزانے کی عمارتیں دیکھیں۔ اس وقت یہ خالی ہال ہی تھے۔ ادھر ادھر سے ٹیکس اکٹھا کر کے انہیں سلاطین کی عیاشیوں پر خرچ کیا جاتا رہا تھا۔ اس معاملے میں یہ بادشاہ ہمارے آج کل کے جمہوری حکمرانوں سے بہرحال بہتر تھے کہ وہ اپنی عیاشیوں کے علاوہ ٹیکسوں کی اس آمدنی کا کچھ حصہ عوام پر بھی خرچ کر دیتے تھے۔ مسلم بادشاہوں نے اپنے زمانے کے معیار کے لحاظ سے تعلیم اور صحت کی جو سہولتیں اپنے عوام کو فراہم کی تھیں، اس کا عشر عشیر بھی غیر مسلم دنیا میں نہیں ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی مسلم دنیا باقی ممالک کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ تھی اور یہاں آ کر رہنا اور تعلیم حاصل کرنا

اہل یورپ کا ایک خواب ہوا کرتا تھا۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے منسوب تبرکات

محل کے مختلف حصوں کو دیکھتے دیکھتے ہم اس کے آخری کونے تک پہنچ گئے۔ یہاں تین چار الگ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں داخل ہوتے ہی تلاوت کی دلنواز آواز کان میں پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سابقہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے منسوب تبرکات موجود ہیں۔ ان تبرکات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک، آپ کے قدم مبارک کا نشان، نعلین مبارک، آپ سے منسوب تلواریں، آپ کا نامہ مبارک، دندان مبارک اور لباس مبارک شامل تھے۔ اس کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے منسوب برتن، سیدنا یوسف علیہ السلام سے منسوب عمامہ، سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے منسوب عصا اور سیدنا داؤد علیہ السلام سے منسوب تلوار بھی اس میوزیم کا حصہ تھیں۔ ان تبرکات کے علاوہ یہاں خانہ کعبہ کی کنجی، حجر اسود کا کیس، خانہ کعبہ کا پرانا دروازہ اور خانہ کعبہ میں استعمال ہونے والا ایک پرانا شہتیر بھی موجود تھا۔ ان تبرکات کی تصاویر اتارنے کی اجازت نہ تھی۔

ان تبرکات کے بارے میں حتمی طور پر تو یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی نسبت ان بزرگوں کی طرف درست ہے یا نہیں البتہ یہ تبرکات ان بزرگوں کی طرف منسوب ضرور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ تبرکات آخری عباسی بادشاہ متوکل نے سلطان سلیم اول کو اس وقت دیے تھے جب سلطان نے عباسی خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے خود کو خلیفہ قرار دیا تھا۔

چونکہ انبیاء کرام خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی چیز کو منسوب کرنا دنیا و آخرت میں سنگین نتائج کا باعث بن سکتا ہے، اس لئے اس معاملے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں صحیح رویہ یہ ہے کہ اگر اس نسبت کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہ ہو تو خاموشی اختیار کی جائے اور کوئی تبصرہ کرنے سے باز رہا جائے۔ ہاں اگر کسی چیز کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف درست ہے تو پھر اس

سے محبت وعقیدت ایک مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ بقول مولانا حسن رضا خان:

جو سر پر رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور۔۔۔۔۔تو پھر کہیں گے کہ ہاں! تاجدار ہم بھی ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب دو اصلی تبرکات ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں اور وہ ہیں آپ کا دیا ہوا قرآن اور آپ کی سنت طیبہ۔ افسوس کہ ہم نے ان تبرکات کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن وسنت کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہماری محبت وعقیدت کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔

میوزیم کے ایک جانب نوادرات کو ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹری بھی تھی۔ یہاں کاربن ڈیٹنگ ٹیسٹ کی سہولت میسر تھی جس کی مدد سے نوادرات کے اصل وقت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

سلاطین کا حرم

تبرکات کی زیارت کے بعد ہم واپس مڑے۔ تھوڑی دیر میں ہم حرم سلطانی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے چند اسباب تو ہم پہلے دیکھ آئے تھے مگر اس زوال کا سب سے بڑا سبب اس وقت ہمارے سامنے تھا اور یہ تھا سلاطین کا حرم۔ جو لڑکی بادشاہوں کو پسند آ جاتی اسے داخل درحرم کر دیا جاتا۔ اس کی تفصیل ہم اپنی کتاب ''اسلام میں جسمانی و ذہنی غلامی کے انسداد کی تاریخ''میں بیان کر چکے ہیں۔ وہی تفصیل ہم یہاں درج کر رہے ہیں:

حرم کے ادارے کا تصور مسلمانوں میں یونانی اور رومی سلطنتوں سے آیا۔ بادشاہ کو جو لڑکی پسند آ جاتی، اسے حرم میں داخل کر دیا جاتا۔ ان میں سے بعض خوش نصیب لڑکیوں کو ملکہ کی حیثیت حاصل ہو جایا کرتی تھی لیکن ان کی زیادہ تر تعداد لونڈیوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ اگر یہ معاملہ صرف بادشاہ تک ہی محدود رہتا تب بھی اس کے اثرات زیادہ نہ پھیلتے لیکن بادشاہ کی دیکھا دیکھی شہزادوں، وزراء، فوجی جرنیلوں، درباریوں اور بڑے تاجروں نے بھی اپنے حرم بنانے شروع کر دیے۔

مسلم سلطنت کے ان علاقوں، جن میں حکومت کی رٹ مضبوط نہ ہوا کرتی تھی، کم سن بچیوں کو

اغوا کر کے لونڈی بنایا جاتا۔ ان میں خاص طور پر وسط ایشیا کے ممالک جارجیا اور آذربائیجان قابل ذکر ہیں جہاں کی خواتین بہت خوبصورت ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں بھی خواتین کی بطور طوائف اسمگلنگ میں ان علاقوں کا ایک خاص کردار ہے۔ اس کے علاوہ غیر مسلم ممالک جیسے یورپ وغیرہ میں بھی بچیوں کو اغوا کر کے مسلم ممالک میں اسمگل کر دیا جاتا۔

ان بچیوں کو تجربہ کار بردہ فروش ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ فروخت ہوتے ہوتے یہ ان لوگوں کے ہاتھ میں آجایا کرتی تھیں جن کا کام ہی ان بچیوں پر طویل المدت سرمایہ کاری کرنا ہوا کرتا تھا۔ ان لونڈیوں کی اعلیٰ درجے کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا اور انھیں شعر و ادب، موسیقی، رقص اور دیگر فنون لطیفہ کی تربیت دی جاتی۔ صنف مخالف کے جذبات کو ابھار کر اسے اپنے قابو میں لانے کی خاص تربیت ان لونڈیوں کو دی جاتی تھی۔ ان کے مربی عموماً ان سے اچھا سلوک کیا کرتے تھے کیونکہ انھیں اپنی انوسٹمنٹ کو واپس وصول بھی کرنا ہوا کرتا تھا۔

جوان ہونے پر ان لونڈیوں کی بولیاں لگتیں اور شاہزادے اور رئیس ان کی خریداری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ جو شخص سب سے زیادہ بولی دیتا وہ لونڈی کا مالک بن جایا کرتا تھا۔ بسا اوقات کچھ رئیس کسی لونڈی کے مربی کو اس کے بچپن ہی میں ایڈوانس رقم دے کر اس کی جوانی کی بکنگ کروالیا کرتے تھے۔ اس صورتحال کے معاشرے پر اثرات سے متعلق رضا الشیرازی لکھتے ہیں:

لونڈیوں کی کثرت ہوتی چلی گئی اور اس کے باعث مردوں کے دلوں سے غیرت نکلتی چلی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ ایک دوسرے کو لونڈیوں کا تحفہ دینے لگے جن میں رومی، ترکی اور ایرانی لونڈیاں شامل تھیں۔ یہ عرب عورتوں کی نسبت زیادہ خوبصورت اور ملائم چہرے کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ پہلے مرد دوسروں کی خواتین کو نہ تو دیکھا کرتے تھے اور نہ ہی ان کی طرف متوجہ ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے خواتین محفوظ ہوا کرتی تھیں۔ جب خواتین کی کثرت ہو گئی تو

غیرت کم ہوتی چلی گئی۔ جب کسی بیوی کے ساتھ اس کے خاوند کی مشغولیت میں کمی واقع ہوگئی تو اس کی عصمت، عقل اور شرف کے بارے میں مرد کی توجہ بھی کم ہوتی چلی گئی۔

جیسے جیسے عباسی عہد میں تمدن ارتقاء پذیر ہوتا رہا، عرب شہروں میں خواتین نے بھی اپنی آزادی اور غیرت کو بھلا دیا۔ بسا اوقات خواتین خود اپنے شوہر کا قرب حاصل کرنے کے لئے اسے خوبصورت لونڈی کا تحفہ دینے لگیں۔ خاوند کا دوسری عورت سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا ان کے لئے بڑا مسئلہ نہ رہنے لگا اور نہ ان کے لئے یہ بات حسد کا باعث رہنے لگی۔ (محمد رضا الشیر ازی، الآداب الاجتماعی فی المملکۃ لاسلامی)

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں جا بجا اس بات کا ذکر کیا ہے کہ خوبصورت رومی لونڈیاں امراء کے حرم میں موجود تھیں۔ اندلس اور ترکی کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ یہاں کے حماموں میں مرد اپنی لونڈیوں کو لے کر غسل کرنے کے لئے جاتے ہیں جہاں مرد و عورت ایک ہی بڑے سے ہال میں برہنہ ہو کر غسل کرتے ہیں۔ اس دور کے حمام کو آج کل کے مساج سینٹر اور بیوٹی پارلر سمجھ لیجیے۔ غرض یہ کہ جو کچھ آج عیاشی کے بڑے بڑے اڈوں پر ہو رہا ہے، وہی سب کچھ مسلم امراء کے حرم میں ہوا کرتا تھا۔

حرم میں داخل ہونے کے بعد لونڈیوں کے ساتھ مختلف قسم کے حالات پیش آیا کرتے تھے۔ بعض لونڈیاں تیز طرار ہوتیں اور اپنے مالک کو قابو میں لے کر اس کے گھر کی مالکن بن بیٹھتیں۔ شاہزادوں اور بادشاہوں کی لونڈیاں بسا اوقات ان کے ہوش و حواس پر چھا کر مملکت کے امور کی نگہبان بن جایا کرتی تھیں۔ ابن الطقطقی کے بیان کے مطابق عباسی بادشاہ الھادی باللہ کو اس کی سوتیلی ماں کے حکم پر لونڈیوں ہی نے اس کا سانس بند کر کے قتل کیا تھا۔

اسی طرح ابن الطقطقی کے بیان کے مطابق آل بویہ کا حکمران عضدالدولہ ایک لونڈی کے عشق میں اتنا پاگل ہوا کہ امور سلطنت سے ہی غافل ہو گیا جس سے پوری سلطنت کا نظام درہم

برہم ہوگیا۔ اس کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود اپنے ہاتھ سے اسی لونڈی کو دریائے دجلہ میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ اسی طرح مغلیہ دور میں انارکلی کی مثال سب کے سامنے ہے جس نے شہزادہ سلیم کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا لیکن جہاندیدہ بادشاہ اکبر نے شہزادے کو اس سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے زندہ دیوار میں چنوا دینے کی سزا سنائی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ محض فکشن ہی ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ شہزادے صاحب اتنے دل پھینک واقع ہوئے تھے کہ جب بادشاہ بنے تو پھر بھی اپنی ملکہ نور جہاں کے مکمل کنٹرول میں رہے۔ اگر جہانگیر کے بعد دو اچھے کردار کے بادشاہ مغلیہ خاندان کو نہ ملتے تو مغلیہ سلطنت کا زوال سو برس پہلے ہی شروع ہو جاتا۔

حرم کی جن لونڈیوں میں تیزی طراری کی صفت مفقود ہوا کرتی تھی، اول تو ان کا شاہی حرم تک پہنچنا ہی ناممکن تھا، اگر وہ یہاں تک پہنچ بھی جاتیں تو بادشاہ یا شہزادے کا دل ان سے جلد ہی بھر جاتا۔ اس کے بعد ان کی پوری زندگی ایک نہایت ہی بھیانک انتظار کا شکار ہو جاتی۔ جو زیادہ پارسائی کا مظاہرہ کرتیں، وہ ہسٹیریا کی مریض بن جاتیں اور جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے دوسرے راستے اختیار کرتیں، وہ شاہی عتاب کی زد میں آ کر موت سے ہمکنار ہوتیں۔

کنیزوں میں محافظوں اور شاہی خاندان کے دوستوں کے ساتھ صنفی تعلقات استوار کر لینے کے واقعات بھی بکثرت ملتے ہیں۔ کسی کنیز سے دل بھر جانے کے بعد اسے کسی دوست یا افسر کو تحفتاً پیش کر دینے کا رواج بھی شاہی خاندانوں میں عام رہا ہے۔ بہت سی کنیزیں محلات کی اندرونی سازش میں مختلف بیگمات، شہزادوں اور شہزادیوں کے جاسوسوں کا کردار بھی ادا کیا کرتی تھیں۔ فریق مخالف کے غالب آ جانے کی صورت میں ان کی بقیہ زندگی پس زنداں گزرا کرتی تھی۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

کرونا وائرس

اس وباء کے آنے سے، پہلے کے یہ منظر تھے
ہم زمین کے باسی راحتوں کے خوگر تھے
شکر بھول بیٹھے تھے، نعمتوں میں رہتے تھے
رنج وغم سے عاری، بے فکر سے رہتے تھے
گہما گہمی رہتی تھی، شہر کی دکانوں میں
اک ہنسی سی رہتی تھی، گلیوں اور مکانوں میں

اور اب یہ عالم ہے، بے ہنر سے بیٹھے ہیں
ہاتھ ہاتھ پر رکھے، بے اثر سے بیٹھے ہیں
دل خوشی سے عاری ہے، سب پہ خوف طاری ہے
ہر نفس پریشاں ہے، رقص موت جاری ہے

سجدہ ریز ہوتے ہیں، تیری ہر عطا پہ ہم
ہاں! بہت ہی نادم ہیں، اپنی ہر خطا پہ ہم
حق کا بول بالا کر، پھر وہی اجالا کر
درد کا ازالہ کر، زخم جاں کا مرہم دے
ہر طرف اندھیرا ہے، شام غم کو کم کر دے
اب زمین والوں پر، اے خدا کرم کر دے
اے خدا کرم کردے

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201 , 0312-2099389
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: 900 روپے (کراچی رجسٹرڈ پوسٹ)، 600 روپے (بیرون کراچی نارمل پوسٹ) اور VP کی صورت میں ڈاک خرچ 150 روپے سالانہ۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروری ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تاکہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جاسکے۔ مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔ شکریہ

0332-3051201 , 0312-2099389

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

Monthly
INZAAR

MAY - JUN 2020
Vol. 08, No. 05-06
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi